داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہوگیا اور مئی کا پرچہ نو روپیہ میں وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۷۷ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۵۸ء | شمار ۴

حرفے چند ---------- ۲
ملاحظات ---------- ۴
فلاسفہ کا تصور الٰہ --- (نواب) محمد عباس طالب صفوی -- ۷
رشید احمد صدیقی ---- محمد عظیم ---------- ۱۵
جعفر علی خاں اثر نقاد کی حیثیت سے --- عطا محمد شعلہ --- ۲۳
بلتازار -- (اناتول فرانس کا ایک شاہکار) ---------- ۳۲
مشرقیات اور علماء مغرب ---------- ۴۱
منظومات ---- فضا ابن فیضی ، شفقت کاظمی ، قاسم شبیر نقوی ۴۵
مطبوعات موصولہ ---------- ۴۹

حرفے چند

"گرت فسانۂ غالب شنیدن ست مخسپ"

زندگی کے لمحات، گھڑیوں میں، گھڑیاں دنوں میں اور دن ایک ایک کرکے ماہ و سال میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ہم ضعیفی میں اپنی طفلی کو بھی نہیں پہچان سکتے، لیکن انسان کی تمنائیں!، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کارگاہِ خیال، امتدادِ زمانہ کے احاطۂ اثر سے جدا کہیں اور قایم ہے، کہ یوں تو ہر شکست و ناکامی "برامید وعدہ ات زنہار نتواں زیستن" کا پیغام نظر آتی ہے، لیکن وہ لمحہ ختم نہیں ہوتا کہ ہم پھر اسی آگ کو مشتعل کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ دلیل کا وزن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ :-

چراغ کشتہ ہماں شعلہ خو نبہا دارد

جب ہم اپنی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر گزرنے والے سال کے ساتھ ہم موت سے

قریب تر ہو جاتے ہیں اور اسی نسبت سے ہمارے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے، لیکن "نگار" چونکہ اس کا تعلق ہماری تمناؤں سے ہے، اس لئے وہاں نہ کوئی فسردگی ہے نہ مایوسی، اور سیکڑوں تلخ تجربات کے بعد بھی وہ اپنے مستقبل کو ویسا ہی رنگین و روشن دیکھتا ہے، جیسا اول دن، سچ ہے

عشق ہر ساعت در آویزد بدامانِ دگر

مجھ سے "نگار" کی جس قدر خدمت ہو سکی، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، اس کا علم غالباً ہر شخص کو ہے کہ:-

از نفس انچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

لیکن مجھے اس کا احساس اور قوی احساس ہے کہ دُنیا سے جس تعاون کی مجھے توقع تھی وہ میں بدقسمتی سے حاصل نہ کر سکا اور اگر مجھے یہ ڈر نہ ہو کہ دُنیا مجھے کم ہمّت کہے گی، تو مجھے ناظرین نگار سے یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ :-

من واندوہِ تو چنداں کہ توانی بشنو

اس وقت تک "نگار" ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کر چکا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک جاری ہے، حالانکہ یہاں سخت سے سخت جان رسالہ بھی چند سال سے زیادہ کا "پیمانِ وفا" نہیں باندھتا، تاہم اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری کامیابیوں نے "راہ در سمِ شکایت" بھی مسدود کر دی ہے لیکن افسوس ہے کہ مجھے یہ شکایت اس جماعت سے ہے جو اگر خود "نگار" کے حقوق نہ پہچانے، تو میرے پاس کوئی ذریعہ اُس کے اندر اس احساس کے پیدا کرنے کا نہیں ہے - میں شکر گزار ہوں اُن حضرات کا جو وقتاً فوقتاً "نگار" کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ فرماتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ :-

تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست

نیاز

ملاحظات

مسئلۂ کشمیر عقلی نقطۂ نظر سے

کشمیر کے مسئلہ پر اس وقت تک مختلف پہلوؤں سے غور کیا گیا ہے جن کا تعلق زیادہ تر سیاسی و قانونی نقطۂ نظر سے ہے۔ قانونی حیثیت سے اس سلسلہ میں بھارت و پاکستان دونوں اپنے اپنے دلایل رکھتے ہیں اور دونوں اپنی اپنی دلایل کی معقولیت پر دستاویزی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اول تو قانون خود اپنی جگہ کوئی ایسی قطعی فیصلہ کن چیز نہیں کہ اس میں کسی تاویل کی گنجایش نہ ہو اور فریقین کو ہر طرح مطمئن کیا جاسکے، دوسرے یہ کہ اس نزاع میں بدقسمتی سے فیصلہ ایک ایسی جماعت کے سپرد ہے جو کوئی قطعی و اذعانی فیصلہ کرنا ہی نہیں چاہتی اور اس معاملہ کو کسی نہ کسی بہانہ سے ملتوی کرتی رہتی ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ اس مسئلہ میں بھارت و پاکستان کے علاوہ ایک اور تیسرا فریق پیدا ہوگیا ہے جو ظاہر میں تو اپنے آپ کو بے تعلق و غیر جانبدار کہتا ہے، لیکن فی الحقیقت وہ چاہتا یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں کو ہٹا کر کشمیر پر خود قبضہ کرلے خواہ یہ قبضہ براہ راست ہو یا کسی ایسی حکومت کے ذریعہ سے ہو جو ہمیشہ اس کی دست نگر بنی رہے۔ ان حالات کو دیکھ کر غالب کا وہ لطیفہ یاد آجاتا ہے کہ :۔ "جب چنے نے خدا سے فریاد کی کہ انسان اس پر کیا کیا ظلم کرتا ہے اور کس کس طرح اسے نوچتا، کھسوٹتا، دلتا، پیستا ہے، تو خدا نے کہا کہ چنے سے کہو کہ ہمارے سامنے سے ہٹ جائے ورنہ ہمارا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے کچا ہی چبا جائیں"۔

الغرض کشمیر اس وقت وہی غالب کا چنا ہے کہ جس عدالت میں اس کی فریاد پیش کی گئی ہے وہ خود اسے ہڑپ کر جانا چاہتی ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں سیکورٹی کونسل سے یہ امید رکھنا کہ وہ جلد یا بدیر کوئی فیصلہ کرسکے گی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ بریں اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر سکیورٹی کونسل کوئی فیصلہ کر بھی دے تو اسے مانے گا کون۔ کیا ہندوستان محض اس کے کہنے سے اپنی فوجیں وہاں سے ہٹا کر کشمیر، پاکستان کو دیدے گا، کیا پاکستان خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے قبضۂ کشمیر کو تسلیم کرلے گا؟۔ اب رہا یہ سوال کہ سکیورٹی کونسل کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ بہ جبر اپنے فیصلہ کو تسلیم کرائے، سو اس کا تعلق نہ انصاف سے ہے نہ قانونی دلایل سے بلکہ خالص سیاسی مصالح سے اور موجودہ حالات اس کی قطعی اجازت نہیں دیتے کہ سکیورٹی کونسل کوئی ایسا جارحانہ قدم اٹھا کر ساری دنیا کو آگ میں جھونک دے۔

الغرض وہ گراہم ہوں یا کوئی اور بزرگ، ہندوستان و پاکستان کا دورہ خواہ وہ ایک بار کریں یا ہزار بار اس نزاع کا فیصلہ کر ہی نہیں سکتے جس کو سکیورٹی کونسل بھی اچھی طرح سمجھتی ہے اور باوجود اس وقوف و آگاہی کے وہ اپنی مجبوریوں کا اعتراف نہیں کرتی۔

اب لیجئے سیاسی نقطۂ نظر سو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک ملکی حدود کا تعلق ہے وہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے لئے یکساں اہمیت رکھتا ہے لیکن ایسے مسایل میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ :۔

ہر کہ شمشیر زنہ سکہ بنامش خوانند

اور کسی دوسرے طریقہ سے مفاہمت یا مسالمت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پھر غور کیجئے کہ اس شمشیر زنی کی ضرورت کسے ہے؟ ہندوستان کو اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جس چیز کا وہ مدعی ہے اس کے قبضہ میں ہے اور پاکستان اس کی جرأت نہیں کرسکتا، کیونکہ اسے ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا اور جنھوں نے اسے جدید ترین آلات حرب فراہم کئے ہیں وہی سب سے پہلے اس اقدام کی مخالفت کرینگے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ آگ صرف کشمیر ہی تک محدود نہ رہے گی بلکہ وہ روس کے میدانوں سے لے کر ساحل امریکہ تک پہونچ جائے گی جس پر اس وقت دنیا کی کوئی قوم راضی نہیں ہوسکتی۔ اور اگر کبھی پاکستان نے باوجود اس بین الاقوامی مخالفت کے تنہا یہ غیر دانشمندانہ

اقدام کیا تو ظاہر ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

الغرض جس حد تک قانون اور سیاست کا تعلق ہے اس مسئلہ کا فیصلہ دشوار ہے اور وہ صرف کشمیر اور اہلِ کشمیر تک محدود ہو جاتا ہے اور وہی اس نزاع کو دور کر سکتے ہیں جسے ہم عقلی نقطۂ نظر کہتے ہیں۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اہلِ کشمیر نے خود بھی اس مسئلہ پر کبھی غور کیا ہے یا نہیں اور وہ کس نتیجہ پر پہونچے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس پر غور کے تین ہی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائیں، دوسرے یہ کہ بھارت کے ساتھ اپنے موجودہ تعلقات کو قایم رکھیں اور تیسرے یہ کہ وہ دونوں سے کٹ کر خود اپنی حکومت جداگانہ قایم کریں۔

تیسری صورت یقیناً بڑی شاندار ہے اور اس وقت جبکہ دنیا میں بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیں آزاد و خود مختار ہو گئی ہیں، یہ جذبہ اہلِ کشمیر میں بھی پیدا ہونا چاہئے کہ وہ اپنی قومی حکومت علٰحدہ قایم کر لیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میں وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں اور اگر ہو سکتے ہیں تو کن اسباب و ذرایع سے۔

اس وقت دنیا کی چھوٹی حکومتوں میں کوئی خود مختار حکومت ایسی نہیں ہے جو کسی دوسری بڑی حکومت کے زیر اثر نہ ہو اور بیرونی امداد کے بغیر زندہ رہ سکے۔ اس لئے فی الحال کشمیر کا صحیح معنے میں آزاد و خود مختار ہونا ممکن نہیں کیونکہ اس کے ذرایع آمدنی اس قدر محدود ہیں کہ وہ نظم و نسق کے بار کو بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ کوئی ترقی کر سکے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی بیرونی سہارا ڈھونڈھے اور قریب تر سہارا پاکستان ہو سکتا ہے یا ہندوستان، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں سے کٹ جانے کے بعد وہ پاکستان سے تو اس کی توقع رکھ ہی نہیں سکتا، کیونکہ وہ خود اپنے حال میں مبتلا ہے اور دوسروں کی امداد کا محتاج، علاوہ اس کے آزاد کشمیر کی موجودہ حالت ظاہر کرتی ہے کہ جب وہ مقبوضہ کشمیر کو بھی تباہی سے نہ بچا سکے تو آزاد کشمیر کی مدد وہ کیا کر سکتے ہیں اور یہی وہ پہلو ہے جس پر غور کرنے کے بعد عقلی نقطۂ نظر سے وہ کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اسے پاکستان میں شامل ہو جانا چاہئے۔

اب رہ گئی تیسری صورت بھارت سے الحاق کی سو اس کے فواید و نتائج اس کے سامنے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد دونوں کشمیروں کا مقابلہ کیا جائے تو دونوں کا پہچاننا دشوار ہو جائے گا، اس سے قبل وہاں انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو حد درجہ پست و دردناک نہ ہو، اقتصادی زبوں حالی، ذہنی جمود، صنعتی پستی، صحت عامہ کی خرابی، ذرایع مواصلت و اسباب نقل و حرکت کا فقدان، الغرض کشمیر انتہائی انحطاط کے دور سے گزر رہا تھا، اور چونکہ وہاں کی آبادی ۹۰ فیصدی مسلمانوں کی تھی اس لئے یہی طبقہ زیادہ متاثر تھا، لیکن تقسیم ہند اور ہندوستان سے الحاق کے بعد کشمیر نے جتنی ترقی کی ہے، اس کا صحیح علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہاں خود جا کر اس کا مشاہدہ کیا جائے۔

کشمیر اپنی گندگی کے لحاظ سے سخت بدنام تھا، لیکن اب وہ آئینہ کی طرح صاف نظر آ رہا ہے، آمد و رفت کے ذرایع وہاں تقریباً مفقود تھے، لیکن اب وہاں ہر جگہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا نظر آتا ہے، وہاں ہزاروں خاندان ایسے تھے جنھوں نے پشتہا پشت سے غلہ کی صورت نہ دیکھی تھی اور صرف سنگھاڑے کے آٹے پر زندگی بسر کرتے تھے، لیکن آج وہاں کوئی گھر ایسا نہیں جو قحط و گرانی کی شکایت کر سکے اس سے قبل وہاں کی صنعت ریشم اور لکڑی کی حد درجہ محدود تھی، لیکن آج اس نے غیر معمولی وسعت و ترقی حاصل کر لی ہے، اس سے پہلے کسی کو علم بھی نہ تھا کہ وہاں کیسی کیسی معدنیں پائی جاتی ہیں، لیکن آج وہاں زمین کے یہ تمام پوشیدہ خزانے دریافت کئے جا رہے ہیں، اس سے قبل وہاں کے مسلمان بچے آوارہ پھرا کرتے تھے اور ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، لیکن آج وہاں جبریہ مفت تعلیم نے ہزاروں گھرانوں میں علم کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ صنعتی تعلیم پہلے وہاں بالکل مفقود تھی، لیکن آج اس کا چرچا ہر جگہ نظر آتا ہے۔ الغرض پچھلے دس سال کے اندر بھارت نے اربوں روپیہ صرف کر کے، کشمیر کو خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے اور اگر ترقی کی یہی رفتار وہاں قایم رہی تو ہو سکتا ہے کہ کشمیر کسی وقت خود کفیل ہو جائے اور وہ دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

پھر یہ وہ حقایق ہیں جن کا علم ہم سے زیادہ اہل کشمیر کو حاصل ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کا اعتراف نہ کریں اور قدرتاً ان کا میلان بھارت کی طرف نہ ہو، جبکہ وہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آزاد کشمیر جو پاکستان کے زیر اثر ہے، کیسے تلخ و صبر آزما دور سے گزر رہا ہے۔ الغرض جس حد تک عقل سے کام لینے کا سوال ہے اہل کشمیر کا فیصلہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ موجودہ حالات میں وہ کسی تبدیلی کو گوارا نہ کریں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب اہل کشمیر بھارت کی طرف سے اس قدر مطمئن ہیں تو عام رائے طلبی کی تجویز ماننے سے بھارت کیوں گریز کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھارت اس پہلو کو بچانا چاہتا ہے، لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ رائے عامہ کے فیصلہ کی طرف سے غیر مطمئن ہے، بلکہ محض اس لئے کہ اگر وہاں مسلمانوں کی ۲۰ فی صدی آبادی بھی ایسی ہے جو محض غلط مذہبی رجحان کے زیر اثر پاکستان سے ملحق ہونا پسند کرتی ہے، تو یقیناً رائے طلبی کے وقت بدامنی و انتشار کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں بھارت کی وہ تمام ترقیاتی اسکیمیں جن پر اس وقت تک بیدریغ دولت صرف کی گئی ہے خاک میں مل جائیں، جو بھارت کے لئے کم لیکن خود اہل کشمیر کے حق میں سخت ٹریجڈی ثابت ہوگی۔

ابن سعود اور جمہوریت متحدۂ عرب

جب کسی سرزمین میں انقلاب کے آثار شروع ہوتے ہیں تو اس کی رفتار اتنی ہی تیز ہوتی ہے جتنی قدامت پرستی کی مدت طویل ہوتی ہے۔ اس لئے مصر و شام کے اتحاد جمہوریت کے بعد اگر ہم سرزمین عرب کے اوراق سیاست کو جلد جلد پلٹتا ہوا دیکھیں تو ہمیں تعجب کرنا چاہئے۔

ہم نے پچھلے ماہ کے پرچہ میں مشرق وسطیٰ کے حالیہ انقلاب پر روشنی ڈالتے ہوئے، ظاہر کیا تھا کہ اس جدید تحریک کی مخالفت سب سے زیادہ سعودی عرب کی طرف سے ہوگی کیونکہ اس سرزمین کی سب سے بڑی مستبد حکومت وہی ہے اور اس کی تصدیق بعد کو ان واقعات سے بھی ہوئی، جو ناصر کی سازش قتل کے سلسلہ میں ظاہر ہوئے اور جن میں سب سے بڑا ہاتھ سعودی حکومت کا تھا۔

لیکن آزادی و حریت کا صحیح احساس اتنی بڑی نعمت ہے کہ ایک بار اس سے لذت آشنا ہونے کے بعد مشکل ہی سے اس کو ترک کیا جا سکتا ہے اور جب یہ احساس کسی قوم میں پیدا ہونے لگتا ہے تو پھر اس کو دبانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ شام، مصر، یمن، یردن اور عراق میں تو یہ احساس پیدا ہوتا اور سعودی عرب اس سے بچا رہتا۔ چنانچہ وہاں کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ سعود اس وقت بڑے خطرہ سے گزر رہے ہیں اور عوام کا رجحان انھیں مجبور کر رہا ہے کہ یا تو وہ تخت سے دستبردار ہوں یا عرب جمہوریت کی تحریک میں عملی حصہ لیں۔

شاہ ابن سعود کا اپنے ولیعہد کو جو وزیر اعظم بھی ہیں، خارجی و داخلی سیاست کے علاوہ مالیاتی شعبہ بھی سپرد کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان پر عوام کا غیر معمولی دباؤ پڑ رہا ہے اور ان کی مستبدانہ ملوکیت خطرہ میں ہے۔

اس وقت ابن سعود کی دستبرداری حکومت کی بھی خبریں آ رہی ہیں جن کی پوری تصدیق ابھی تک نہیں ہو سکی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آواز وقت کی آواز ہے اور اگر ابن سعود نے اس آواز پر کان نہ دھرا تو بہت جلد عنان حکومت انھیں، اس نوجوان جماعت عرب کے سپرد کر دینا پڑے گی، جو اب امریکہ و برطانیہ کے ہاتھ میں اپنی قسمت کا فیصلہ چھوڑنے کے لئے طیار نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ناصر اس وقت، مشرق وسطیٰ کا ہیرو ہے جس نے نہ صرف مصر بلکہ تقریباً تمام فرزندان عرب کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ کسی وقت مصر اور تمام عرب حکومتیں ایک ہی وفاقی قسم کی جمہوریت سے وابستہ ہو جائیں، اور اس میں شک نہیں کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ تاریخ کا بڑا زبردست انقلاب ہوگا جو ایک طرف جمہوریت کو اشتراکیت سے اور اشتراکیت کو جمہوریت سے قریب تر کر دے گا۔

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

(یہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء)

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

۱۳- ارسطو

یونان کا سب سے بڑا فلسفی[۱] ۳۸۴ سنہ ق ۔م میں تھریس کے ایک بندر گاہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نکومیس، شاہ مقدو کا طبیب خاص تھا اور ان تعلقات کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں ارسطو کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا رہا[۲]۔ نکومیس کا انتق ارسطو کے عنفوانِ شباب میں ہوگیا اور سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں اُس کو افلاطون کے حلقۂ تلامذہ میں داخل کردیا گیا اور اس میں کوئی شبہ کہ ارسطو کی خالص سائنٹفک تصانیف کے ہر صفحے میں افلاطون کا اثر کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آتا ہے[۳]۔ گو اس نے افلاطون پر اعتراضات کے لیکن ان سے یہ سمجھنا کہ وہ افلاطون کا دشمن تھا صحیح نہیں۔

افلاطون کے انتقال کے چار سال بعد ارسطو کو بھی افلاطون و سقراط کی طرح اپنے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع حاصل ہوا، یعنی ۳۴۳ سنہ ق ۔م میں مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے ارسطو کو اپنے سیزدہ سالہ لڑکے سکندر کا اتالیق مقرر کیا اور ۳۴۰ سنہ ق ۔م تک ارسطو اس عہدہ پر فایز رہا[۴]۔

سکندر کو بعض مورخین صرع (مرگی) کا مریض بیان کرتے ہیں[۵] اور اکثر مورخین اس پر زیادہ زور دیتے ہیں[۶]۔ بہر نوع واقعہ جو کچھ ہو لیکن سکندر اور ارسطو کے مفروضہ مکاتیب جعلی سمجھے جاتے ہیں اس لئے صحیح طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ تین برس کے دور [illegible] میں ارسطو اور سکندر کے تعلقات کیسے رہے؟ ہیگل کے خیال میں سکندر نے سکندرِ اعظم بن کر یہ ثابت کردیا کہ فلسفے کی تعلیم سے کیا عملی فایدہ پہونچ سکتا ہے لیکن اگر ان فتوحات کا وسیع ہونا ہی سکندرِ اعظم کی خاص عظمت کا باعث ہے تو پھر اس میں چنگیز اور ہلاکو ایسے وحشی بھی اس کے ہمسر نظر آئیں گے اور اگر سکندر کے کردار میں فلسفہ کی تعلیم کی وجہ سے رفعت پیدا ہوئی تھی تو کم از کم تاریخ کے صفحات اس رفعت کے ذکر سے خالی ہیں۔ کیا خوب قول مسٹر بین کا کہ اگر فلسفہ اپنی خوبی ثابت کرنے کے لئے سکندر کے کردار سے بہتر کردار پیش نہیں کرسکتا تو مقامِ افسوس ہے۔ سکندر خود سر، شرابی، ظالم کینہ پرور اور توہمات کا اسیر تھا[۷]۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سکندرِ اعظم کے فتوحات کا سہرا بھی ارسطو کے سر نہیں باندھا جاسکتا کیونکہ افلاطون کی طرح ارسطو بھی یونانیوں کو خلاصۂ کائنات سمجھتا تھا اور سکندر کے باپ فلپ کو ایشیا کی فتح سے اس خدشے کی بنا پر منع کرچکا تھا کہ

---

۱ The Story of Philosophy By Will Durant p. 95
۲ A Critical History of Greek Philosophy page 249
۳ Aristotle By Dr. W. D. Ross page 2
۴ History of Philosophy By Weber page 77
۵ The Story of Philosophy By Will Durant p. 52
۶ A History of Western Philosophy page 183
۷ A History of Western Philosophy page 183.

کہیں ایشیا کے وحشیوں کا اثر یونانیوں کی تہذیب پر نہ پڑے[1]۔

میں مورخین کے اس خیال سے متفق ہوں کہ سکندر اور ارسطو ایک دوسرے پر کوئی اثر نہ ڈال سکے بلکہ میری تو یہ رائے ہے کہ جس طرح ارسطو نے سکندرِ اعظم کی وسیع سلطنت کے باوجود پالیٹکس نامی تصنیف میں مثالی ریاست کے حدود کو اتنا مختصر رکھنا ضروری سمجھا ہے کہ ریاست کے باشندے ایک دوسرے کے کردار سے واقف رہیں[2]۔ اسی طرح سکندر کے خدائی کے دعوے[3] کے علی الرغم ارسطو نے خود خدا کو مسلوب الاختیار اور ڈاکٹر ولیم ڈیوراں کے الفاظ میں " انگلستان کے حکم راں کی طرح بے دست و پا[4]" تصور کرنا لابدی تصور کیا ہے۔

مورخین سکندر کے لطف و کرم کے ان حکایات کو صحیح نہیں سمجھتے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سکندر نے ارسطو کو کتابوں کی خریداری کے لئے کروڑوں روپئے دئے اور نباتات کی تلاش کے لئے ہزاروں غلاموں کو جزایر میں روانہ کیا[5] بلکہ اس کے برعکس یہ بیان کرتے ہیں کہ جب سکندر نے ایشیائی ممالک کی فتح کے بعد دیوتا ہونے کا دعوے کیا اور ارسطو کے بھانجے کیلس تھینیز نے سکندر کو دیوتا ماننے سے انکار کیا تو ارسطو نے سکندر سے اس کے قتل کے حکم کے خلاف احتجاج کیا اور سکندر، ارسطو کے اس احتجاج سے چراغ پا ہوگیا[6]۔

بہر نہج سکندر کی زندگی تک ارسطو، ایتھنز میں اطمینان کے ساتھ اپنے علمی مشاغل میں مصروف رہا لیکن سکندر کے انتقال کے بعد ۳۲۳ سنہ ق۔م میں ایتھنز کے باشندوں نے مقدونیہ کا قلادۂ اطاعت اُتار ڈالا اور جس طرح اس سے قبل سقراط وغیرہ کے سیاسی جرائم کی سزا الحاد کا الزام لگا کر دی گئی بالکل اسی طرح ارسطو کو مقدونیہ کا ہوا خواہ سمجھ کر اس پر بے دینی کا الزام عاید کیا گیا لیکن ارسطو چالیس بھاگ گیا اور ڈاکٹر راس کے بیان کے مطابق ایک مزمن مرض میں[7]۔ یا پروفیسر اعیش کی تحقیق کے مطابق کسی مرض کے اچانک رونما ہونے کی وجہ سے[8]۔ یا ڈاکٹر ولیم ڈیوراں کے قول کے مطابق آلامِ روزگار سے تنگ ہوکر زہر پی لینے کی وجہ سے[9] ۳۲۲ سنہ میں ارسطو کا انتقال ہوگیا۔

ارسطو کے تصانیف کا جو نسخہ انڈرونیکس نے ۶۰ سنہ ق۔م اور ۵۰ سنہ ق۔م کے درمیان مرتب کیا، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے

---

۱ Aristotle By Dr. Ross p. 4

۲ A History of Western Philosophy p. 215

۳ The Story of Philosophy page 94.

۴ افلاطون کے بیان میں θεος کے لفظ پر بحث کی جاچکی ہے۔ اسی سلسلہ میں میں نے ۲۶ اگست ۵۸ء کو سفیر یونان متعینۂ دہلی کو مزید وضاحت کے لئے ایک خط بھیجا اور سفارت خانۂ مذکور کے سکریٹری مسٹر کوزوپولوس نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۳۱ اگست ۵۸ء۔ نمبر ۶۲۵ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ " ΘΕΟΣ (ای ایوس) کا لفظ عصرِ عیسائیت سے لے کر آج تک خدا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن افلاطون وغیرہ نے اس لفظ کو اسم کے طور پر بھی استعمال کیا اور صفت کے طور پر بھی، مذکر کے لئے بھی استعمال کیا اور مونث کے لئے بھی، دیوی دیوتاؤں کے لئے بھی استعمال کیا اور ایک ایسی ہستی کے لئے بھی جو تقریباً خدا کے ہم معنی ہے"۔ لہذا میں بھی کبھی دیوتا لکھتا ہوں اور کبھی خدا۔

۵ The Story of Philosophy page 72

۶ A Critical History of Greek Philosophy p. 251

۷ The Story of Philosophy page 93

۸ Aristotle By Dr. Ross page 1

۹ A Critical History of Greek Philosophy p. 252

۱۰ The Story of Philosophy page 94

ایک ہزار کتابیں تصنیف کیں[1] لیکن دوسرے مورخین کی نظر میں اس کی تصانیف کی تعداد چار سو تھی[2]۔ ہمارے زمانہ کے فلاسفہ نے تشریح کی ہے کہ اس کی کتابیں زیادہ ضخیم نہیں ہوتی تھیں بنا برایں اُن کو رسالہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، انھوں نے اس امر کی بھی توضیح کی ہے کہ اس کے تصانیف کا ۳/۴ سے زیادہ حصہ تلف ہوگیا اور جو ربع حصہ ہم تک پہونچا اس کے رسایل ناتمام صورت میں ملے اور تحریف سے بالکلیہ محفوظ نہیں رہے ارسطو کی کتاب "مابعد الطبیعیات" جس کا نام خود اس نے تو اولین فلسفہ رکھا تھا مگر جو انڈرونیکس کے مرتب کردہ نسخے میں طبیعیات کے رسالے کے بعد درج ہونے کی وجہ سے میٹافزکس یعنی مابعد الطبیعیات کے نام سے مشہور ہوگئی[3]۔ اور جو ارسطو کے تصورِ الٰہ پر واضح روشنی ڈال سکتی تھی خصوصیت کے ساتھ موردِ اشتباہ ہے اور پروفیسر اسٹیس نے اس پر ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے کہ " یہ نسخہ ناتمام ہے اور اغلباً خود اس کے مصنف نے اپنی موت تک اسے ناتمام رکھا" لیکن اس سے قطع نظر یوں بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مابعد الطبیعیات نامی کتاب کے متعدد رسالے یقیناً جعلی ہیں اور بقیہ رسالے غلط سلسلے سے درج کئے گئے ہیں۔ ہم ایک رسالہ کے آخر میں کسی موضوع پر ناتمام بحث کو دیکھ کر بعد کے رسالے کو دیکھتے ہیں مگر اس میں کسی دوسرے ہی موضوع پر بیچ سے بحث شروع کر دی جاتی ہے۔ مابعد الطبیعیات میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اور اس کے بعض حصے تو محض لیکچر نوٹس معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو کے دوسرے تصانیف میں بھی یہ عیوب ہیں مگر مابعد الطبیعیات سے کم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان رسالوں کو کتابی صورت میں پیش کرنا مقصود نہیں تھا اور وہ نظر ثانی سے محروم رہے[4] لیکن ان عیوب کے باوجود جیسا کہ پروفیسر اسٹیس نے خود اسی صفحے پر اعتراف کیا ہے ارسطو کے تصانیف ہے ہمیں اس کے نظریات کا علم ہوسکتا ہے اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اتلاف کے باوجود اور جعلی رسالوں کو نظر میں رکھنے کے بعد بھی منطق - خطابیات - سیاست - شعر - طبیعیات - مابعد الطبیعیات اور دوسرے موضوعات کے متعلق اب بھی ارسطو کی اتنی تصانیف موجود ہیں کہ انکے مجموعے کو ڈاکٹر ڈیوراں کے الفاظ میں فلسفے کی انسائکلوپیڈیا برٹینکا کہا جاسکتا ہے[5]۔

مجھے تنوعِ مضامین سے کہیں زیادہ ارسطو کا طرزِ تحریر بیش بہا معلوم ہوتا ہے بایں معنی کہ افلاطون کا شاگرد ہونے کے باوجود اور ادب پر افلاطون سے بہتر نثرِ مرصع لکھنے کے بعد بھی ارسطو نے ادب اور سائنس کے فرق کو ملحوظ رکھا اور سائنس کے مسائل کے متعلق افلاطون کی طرح نثر میں شاعری کرنے کے بجائے سنجیدہ اور عالمانہ طرزِ تحریر کو اختیار کیا اور ہر فن کے مصطلحات اس کثرت سے وضع کئے[6] کہ عصرِ حاضر میں بھی ہم کسی علم کے متعلق ارسطو کے مصطلحات کو استعمال کئے بغیر گفتگو نہیں کرسکتے[7]۔ مابعد الطبیعیات نامی کتاب میں ارسطو کے سب سے پہلے اپنے عصر تک کے یونانی افکار کا جایزہ لیا ہے اور اس مابعد الطبیعیات کا پہلا حصہ یونانی فلسفہ کی اوّلین تاریخ بھی ہے[8]۔ ارسطو نے متقدمین کے نظریات پر مجملاً اور اپنے استاد افلاطون کے نظریات پر بالتفصیل بحث کی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے افلاطون کا نظریۂ تصورات بے انتہا مبہم ہے اور ہمارے عصر کے سب سے بڑے حقیقت پسند فلسفی

---

1. A History of Philosophy By Thilly page 97
2. A Critical History of Greek Philosophy page 253
3. The Philosophy of Aristotle By Dr. Allen p. 102
4. A Critical History of Greek Philosophy p. 253
5. The Story of Philosophy page 56.
6. A Critical History of Greek Philosophy p. 259
7. The Story of Philosophy page 56
8. God & The World By Prof. Forsyth page 45

پروفیسر جی۔ ای۔ مُور کا بالکل صحیح خیال ہے کہ " افلاطون کا نظریۂ تصوّرات حقیقتاً صرف نظریۂ جواہر ہے اور اس نظریہ پر ہر عصر میں کامل غور و خوض کرنے کے باوجود کوئی شخص اس عقدۂ لاینحل کو حل نہ کر سکا کہ جوہر ہے کیا اور وہ عرض یا فرد سے الگ کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ بعض فلاسفہ نے تو سرے سے کلیات کے تصورات ہی سے انکار کیا ہے"[1]۔ ارسطو نے اس نظریۂ تصورات پر درج ذیل اعتراضات کئے ہیں:۔ اولاً یہ کہ ارسطو کا نظریۂ تصوّرات موجودات کی دُنیا کی توجیہ کرنے سے قاصر ہے بایں معنی کہ اگر ہم افلاطون کے ہم خیال ہو کر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ سفیدی کا تصور اور وجود تمام سفید اشیاء سے ماوراء ہے جب بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سفیدی کے اس تصور سے کائنات کی تمام سفید چیزیں کیونکر معرضِ وجود میں آئیں؟

ثانیاً یہ کہ افلاطون کا یہ قول کہ موجودات تصوّرات کی نقل ہیں اور تصوّرات میں شامل ہیں محض شاعرانہ استعارہ ہے بایں معنی کہ افلاطون یہ بیان کرنے سے قاصر رہا کہ مثلاً تمام زرد چیزیں زردی کے تصور میں کیونکر شامل ہیں؟

ثالثاً یہ کہ اگر بفرضِ محال تمام زرد اشیاء زردی کے تصوّرات سے معرضِ وجود میں آئیں جب بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کہ افلاطون کے قول کے مطابق تصوّرات میں نہ حرکت ہے نہ تغیر تو پھر زردی کے تصور کی نقل یعنی زرد اشیاء میں حرکت اور تغیر کیوں ہے؟

رابعاً یہ کہ افلاطون نے اقل المفروضات پر عمل کرنے کے بجائے موجودات کی اشیاء کے مقابلہ میں تصوّرات کی دنیا بسا کر کثرت کو دُگنا کر دیا گویا اُس شخص نے جو دس تک کی گنتی بھی نہیں جانتا یہ فرض کر لیا کہ اگر دس کے بجائے بیس تک کی گنتی ہو تو اُس کی سمجھ میں آجائے گی۔

خامساً یہ کہ افلاطون نے یہ تو فرض کر لیا کہ محسوسات کی دنیا کی توجیہ کے لئے بے حس تصوّرات کا وجود ضروری ہے لیکن حقیقتاً وہ تصور کو بے حس ثابت کر سکا یعنی گھوڑے کا تصور ہو یا انسان کا وہ موجود گھوڑے اور موجود انسان کی طرح غیر محسوس نہیں بلکہ حواسِ خمسہ کے ادراک کے اندر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح یونان والوں نے انسانوں کو دیوتا بنا ڈالا اسی طرح افلاطون نے محسوسات کی دنیا کی نقل کر کے تصورات کا عالم آباد کر دیا۔

سادساً یہ کہ اگر افلاطون صور یعنی تصورات کو اعراض کا جوہر مانتا ہے تو وہ ان صور کو اعراض سے علیحدہ کیوں تصور کرتا ہے یعنی اگر سفیدی جوہر ہے اور تمام سفید اشیاء میں شامل ہے تو پھر افلاطون اس سفیدی کے جوہر یا صورت کو تمام سفید اشیاء سے ماورا کیوں سمجھتا ہے؟ ارسطو، افلاطون کی طرح جوہر کے وجودِ حقیقی کا تو قایل ہے لیکن افلاطون کے برعکس وہ عرض کے بغیر جوہر کے وجود کو نہیں مانتا لیکن جیسا کہ اس سے قبل معرضِ تحریر میں لایا جا چکا، ارسطو کے فلسفیانہ تصنیفات کے ہر صفحہ میں افلاطون کا رنگ جھلکتا ہے اور اس نے جوہر عرض کو شکل و ہیولیٰ کی صورت میں پیش کر کے افلاطون کا سا ابہام پیدا کر دیا ہے اور نہ صرف انیسویں صدی میں پروفیسر زیلر نے اپنی تصنیف میں ارسطو پر یہ اعتراض کیا کہ ارسطو کی شکل افلاطون کے تصور کی طرح مابعد الطبیعیاتی وجود رکھتی ہے[2] بلکہ بیسویں صدی میں بھی پروفیسر برٹرنڈ رسل نے عمر کے معتدبہ حصے تک حقیقت پسند فلسفی ہونے کے باوجود اس اعتراض کے بعد کہ چونکہ ارسطو نے روح کو شکل اور جسم کو ہیولیٰ بتایا ہے اور چونکہ خود ارسطو کی دی ہوئی کانسی کے مجسمے کی مثال یعنی کانسی کا ہیولیٰ اور کرویت کا شکل ہونا روح پر خود ارسطو کے اس بیان کی وجہ سے کہ روح جسم کو محض شکل نہیں عطا کرتی بلکہ جسم کے اجزاء کو ایک کُل بناتی ہے روح اور جسم پر منطبق نہیں ہوتی اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افلاطون کی طرح ارسطو کی نظر میں بھی جوہر کا وجود عرض کے ماسوا ہے صریح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ ارسطو کا نظریۂ شکل و ہیولیٰ افلاطون کے نظریۂ تصوّرات کی یادگار ہے[3]۔

---

[1] Some Main Problems of Philosophy By Moore p. 353

[2] A Critical History of Greek Philosophy pp. 262-65

[3] History of Western Philosophy page 189

[4] History of Western Philosophy page 188

افلاطون کے اس اثر سے ارسطو کا تصورِ الٰہ بھی محفوظ نہیں رہا اور اگرچہ بادی النظر میں ارسطو کا تصورِ الٰہ قطعاً علٰحدہ نظر آتا ہے تاہم حقیقتاً اس تصور میں بھی افلاطون کے تصور کی طرح ابہام اور تضاد موجود ہے۔

مابعد الطبیعیات کے آغاز میں ارسطو نے اپنے پیش رووں کے تصورات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ ارسطو کے خیال میں متقدمین فلاسفہ یعنی طالیس وغیرہ نے صرف اس امر کی سعی کی کہ کسی ایسے مادّے کا وجود ثابت کیا جائے جو کائنات کی اصل ہے چنانچہ کسی نے اصل کائنات پانی کو تصور کیا کسی نے ہوا کو اور کسی نے کسی اور عنصر کو لیکن اس تصور سے کوئی ایسی شے ذہن میں نہیں آئی جو خود تغیر اور حرکت سے محفوظ ہو مگر تغیر اور حرکت کی علتِ فاعلی ہو۔ امپیڈوکلیز نے اس اُلجھن کو محبت اور نفرت کے تصور سے دور کرنا چاہا اور فیثا غورثیوں نے صحت و اعداد سے لیکن چونکہ یہ سب چیزیں بے حس تھیں لہٰذا اصل مسئلہ پھر بھی لاینحل رہا اور انیکساغورس کو ایسے دماغ کا تصور پیش کرنا پڑا جو حرکت اور علم کا منبع ہے اور افلاطون کو نظریۂ تصورات خصوصاً نظریۂ تصورِ خیرِ محض پر یہ عمارت تیار کرنا پڑی کہ کائنات کے وجود کا کوئی مقصد ضرور ہے لیکن دماغ ہو یا صور ان کو اس وقت تک کائنات کی چیزوں کا علم نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان چیزوں میں شامل نہ ہوں اور اگر دماغ اور صور ان اشیاء میں شامل ہیں تو وہ ان کی علتِ فاعلی نہیں ہو سکتے[1]۔ شاید اسی اعتراض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ارسطو نے پارمینائڈز کے عقیدۂ وحدۃ الوجود کے متعلق یہ سخت الفاظ استعمال کئے کہ اگر پارمینائڈز کا نظریۂ وحدۃ الوجود منطق کی رو سے صحیح معلوم ہوتا ہے تاہم اس پر یقین کرنا دیوانگی ہے بلکہ شاید کوئی دیوانہ بھی ایسا نہ ہوگا جو آگ اور برف کو ایک سمجھے[2]۔

ارسطو نے خدا کے وجود کو دو خالص منطقی دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔ اُس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ہر شے کے وجود کے لئے چار علتوں کا ہونا لازمی ہے اولاً علتِ مادّی ثانیاً علتِ صوری ثالثاً علتِ فعلی اور رابعاً علتِ غائی۔ مثلاً اس کرسی کی علتِ مادّی جس پر میں بیٹھا ہوں لکڑی ہے علتِ صوری کرسی کی شکل ہے علتِ فعلی بڑھئی کے وہ اوزار ہیں جن کی مدد سے کرسی بنائی گئی اور علتِ غائی سے بڑھئی کا مقصد مراد ہے۔

ایوری مینس لائبریری کے شایع کردہ ترجمۂ مابعد الطبیعیات کے صفحات ۳۲۷ - ۵۰ پر ارسطو نے علتِ غائی کے متعلق متقدمین کے دلایل پیش کر کے ان پر بحث کی ہے۔ اس بحث میں اُکتا دینے والا اطناب ہے اور اس اطناب کے علاوہ ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے مثلاً افلاطون کے نظریۂ صور پر پانچویں اعتراض میں یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ یہی خاص اعتراض ہے اس خاص اعتراض کے علاوہ بائیس اعتراضات محض طولِ مقال کے لئے پیش کئے گئے ہیں[3]۔ یا مثلاً امپیڈوکلیز کے نظریۂ وحدۃ الوجود پر اس اعتراض کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ چونکہ امپیڈوکلیز علتِ غائی محبت اور نفرت دونوں کو سمجھتا ہے لہٰذا اس کا نظریہ وحدت کا نظریہ نہیں بلکہ ثنویت کا نظریہ ہے[4]۔ اس طولِ مقال اور مکررات کو محذوف کرنے کے بعد ارسطو کے دلایل بالاجمال یہ ہیں کہ ہمیں محسوسات سے شے کے مجرد وجود کا تو احساس ہوتا ہے لیکن اس کی کیفیت کا علم نہیں ہوتا یعنی ہمیں آگ کی گرمی کا احساس تو ہوتا ہے۔ لیکن حواسِ خمسہ کی مدد سے ہم یہ کبھی بھی نہیں بتا سکتے کہ آگ گرم کیوں ہے؟۔ ارسطو کے نزدیک پارمینائڈز کے علاوہ ہر قدیم فلسفی نے اصلِ اصول کو سمجھنے کے لئے محسوسات کی دُنیا سے آگے قدم نہیں بڑھایا حتیٰ کہ انیکساغورث نے بھی مجبوری و باکراہ دماغ کا تصور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کی ہر شے کا باعث دماغ کے علاوہ مادی چیزوں کو سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کا کوئی فلسفی یہ نہ بتا سکا کہ آخر آتش و آب و باد و خاک یا دماغ نے کائنات کی موجودہ صورت کو کیونکر اختیار کیا؟ رہا پارمینائڈز کا نظریۂ وحدۃ الوجود تو جیسا

---

[1] God And The World By Forsyth pages 49-50

[2] A History of Western Philosophy page 88

[3] Aristotles' Metaphysics Translated By John Warrington (Everyman's Library 1956) pp. 75-83.

[4] Aristotle's Metaphysics pp. 61, 63, 105-107 etc.

اس سے قبل معرضِ تحریر میں لایا جا چکا ہے ارسطو اسے جنون سمجھتا تھا۔ ان دلایل کے بعد ارسطو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ایک ایسی علتِ غائی اور اصل کائنات ضرور موجود ہونا چاہئے جس کا جوہر وجودِ محض ہو[1] لیکن اس کے فوراً ہی بعد اس فقرے کا اضافہ کرتا ہے کہ غیر متغیر جواہر کو یقیناً غیر مادی ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ ابدی ہیں اور وجودِ محض ہیں۔ اسی طرح مقصدِ کائنات کو کبھی تو ارسطو خدا اور فطرت پر مبنی کرتا ہے اور کبھی بلکہ اکثر صرف فطرت پر اور ہمارے عصر کے مشہور فلسفی سر ڈیوڈ راس جو ارسطو پر حجت سمجھے جاتے ہیں بجا طور سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کائنات کا کچھ مقصد ہے تو یہ علتِ غائی یا تو خود صاحبِ عقل ہوگی اور یا پھر کسی اور صاحبِ عقل کے تابع یعنی بہر حال غیر شعوری مقصد جو کسی کی فکر کا نتیجہ نہ ہو حقیقتاً مقصد نہیں کہا جا سکتا لیکن تعجب ہے کہ عصر حاضر کے اکثر مفکرین کی طرح ارسطو نے بھی فطرت کے غیر شعوری مقصد کی دشواری کو محسوس نہیں کیا[2]۔

خدا کے وجود کی دوسری دلیل ارسطو نے اس طرح پیش کی ہے کہ چونکہ زمان ازلی اور ابدی ہے یعنی اگر زمان نہ ہو تو نہ قبل ہے نہ بعد اور چونکہ زمان یا تو خود حرکت ہے یا حرکت کی صفت لہٰذا حرکت بھی زمان کی طرح ازلی اور ابدی ہے۔ اگر ہم اس نظریہ سے انکار کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کائنات عدمِ محض سے ظہور پذیر ہوئی اس لئے ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ کوئی شے مسلسل حرکت کر رہی ہے یعنی ثوابت کا فلکِ اول ازل سے متحرک ہے اور چونکہ وہ مسلسل حرکت پذیر ہے لہٰذا یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کو حرکت دینے والا بھی کوئی نہ کوئی ہے جو خود غیر متحرک - ازلی - جوہرِ اول اور وجودِ محض ہے۔ کائنات کی ہر شے دوسری شے کو متحرک کرنے کے لئے خود حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ غیر متحرک حرکت دینے والا ہر شے کو محض جذبۂ عشق سے متحرک بناتا ہے اور خود اسے حرکت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ اصل کائنات جوہرِ اول تمام محسوسات سے قطعاً علٰحدہ ہے جسم و جسمانیت سے منزہ ہے حیات و تسلسل ازل اور ابد اُس کے قبضۂ قدرت میں ہیں بلکہ وہ خود حیات و تسلسل ازل اور ابد ہے اور چونکہ یہ جوہرِ اول یہ عقلِ اعلیٰ کائنات کی بہترین شے ہے لہٰذا اسے اپنے سے کسی پست تر شے کا نہ خیال ہو سکتا ہے نہ علم اُسے صرف اپنی ذات کا خیال اور علم ہو سکتا ہے بنا بریں اُس عقلِ اعلیٰ کا خیال در اصل خیال کا خیال ہے[3]۔ ارسطو نے اغلباً افلاطون کے تتبع میں خدا کو خیر کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے اور اس موضوع پر کہ آیا خیر کائنات سے علٰحدہ ہے یا شاملِ طولانی بحث کی ہے۔

ارسطو نے یہ بتایا ہے کہ اس کائنات کے تمام اشیاء کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اُس کے خیال میں یہ کائنات ایک بڑے گھر کی طرح ہے جس میں آقا بھی ہو غلام بھی ہو اور جانور بھی ہوں اور جس طرح غلام اور جانور کی زندگی بظاہر بے مقصد لیکن در اصل اپنے آقا کی خدمت کے لئے ہوتی ہے اسی طرح ادنیٰ موجودات کی بقا کے باعث بنتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس طرح فوج کی خوبی اگرچہ زیادہ تر جنرل پر منحصر ہوتی ہے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اس خوبی کا انحصار فوج پر بھی ہوتا ہے بالکل اسی طرح خیر کا انحصار کائنات سے علٰحدہ خیرِ محض پر بھی ہے اور کائنات میں شاملِ خیرِ محض پر بھی[4]۔ میری نظر میں ارسطو نے صرف اس جگہ خدا کو کائنات میں کسی نہ کسی حد تک شامل سمجھا ہے ورنہ بالعموم خدا کو افلاطون کے شفیق باپ اور معشوقِ باوفا کے تصور کے بجائے کائنات سے قطعاً علٰحدہ ایک معشوقِ بے نیاز سمجھا ہے۔

ظاہر ہے کہ ارسطو کا یہ تصورِ الٰہ مذہب کے موافق نہیں اور جب کہ وہ اس تصور کے ساتھ مادے کی ازلیت کا مقر اور کائنات کی تخلیق کا سختی کے ساتھ منکر بھی ہو اور عقل کی ازلیت اور ابدیت کا بھی قایل ہو[5] تو پھر کوئی مذہب تاویل کے بغیر ارسطو کا ہمنوا نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے ہر مورخ نے ارسطو کے تصورِ الٰہ کو مذہب کے مخالف

---

[1] Metaphysics page 342
[2] Aristotle 1969 Edition page 186
[3] Metaphysics pages 342-350
[4] Metaphysics page 351
[5] Aristotle By Ross page 184

سمجھا ہے[1]۔ لیکن سوال صرف تصورِ الٰہ کا نہیں ہے بلکہ تعددِ الٰہ کا بھی ہے یعنی مابعد الطبیعیات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ارسطو خ
اپنے دلایل کے خلاف کسی ایک جوہر یا غیر متحرک محرک کا نہیں بلکہ متعدد ازلی اور ابدی جواہر یا غیر متحرک محرکین کا قایل تھا۔ ایوری منس
لائبریری کی شایع کردہ میٹافزکس کے مترجم اور مقدمہ نگار مسٹر جان وارنگٹن نے مقدمے کے صفحہ ۱X پر سر ڈیوڈ راس سے متفق الخیال
ہو کر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ باب ہشتم یعنی جس باب میں متعدد غیر متحرک محرکین کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے ارسطو نے آخرِ عمر میں
تحریر کیا ہے اور اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ان نظریات سے قطعاً مختلف ہیں جو باب ششم و ہفتم میں صرف ایک غیر متحرک
محرک کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں مگر خود انھیں مسٹر جان وارنگٹن نے اسی باب ششم کے ان الفاظ پر کہ "غیر متغیر جواہر کو یقیناً
غیر مادی ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ ابدی ہیں اور وجودِ محض ہیں"۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ ارسطو نے اس مقام پر متعدد غیر متحرک محرکین
کے عقیدے کی داغ بیل ڈالی ہے جس کی تکمیل اس نے بہت عرصہ کے بعد باب ہشتم میں کی ہے[2]۔ یعنی بالفاظ دیگر ارسطو اپنی عمر کے آخری
حصہ میں نہیں بلکہ شروع ہی سے صرف ایک جوہر اول یا غیر متحرک محرک یا عقل اعلیٰ کا قایل نہیں تھا بلکہ تعدد قدماء کا قایل تھا۔

میں متقدمینِ فلاسفۂ یونان کے ذکر میں بتا چکا ہوں کہ اُن میں سے اکثر ستاروں کو دیوتا سمجھتے تھے بلکہ ارسطو کے الفاظ میں ستاروں
کو دیوتا ماننے کا عقیدہ یونانی اور وحشی اقوام میں مشترک تھا[3]۔ لیکن ستاروں کو موثر ماننے کا عقیدہ یعنی علم نجوم یونانیوں میں سب سے پہلے
سکندرِ اعظم کے عہد میں ایک کلدانی بیروسس کی وساطت سے رائج ہوا اور بہترین فلاسفہ بھی نجوم کے معتقد ہو گئے[4]۔ میری رائے میں
مذہبی عقاید اور نجوم کے معتقدات کا مرکب ارسطو کے تعدد محرکین کے نظریہ کی شکل میں ظاہر ہوا یعنی ارسطو نے خود ستاروں کو تو دیوتا
نہیں مانا لیکن ستاروں کے چلانے والے غیر متحرک جواہر و عقول کو یقیناً دیوتا مانا۔

ارسطو نے تعددِ محرکین کی بحث کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے "ہمیں اس اہم سوال کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ صرف ایک
ازلی اور غیر متغیر جوہر کو ماننا ضروری ہے یا متعدد غیر متغیر اور ازلی جواہر پر ایمان لانا ضروری ہے اور اگر یہ غیر متغیر اور ازلی جواہر
ایک سے زیادہ ہیں تو آخر اُن کی تعداد کیا ہے؟ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہمارے پیش رووں میں سے کسی ایک نے بھی اس موضوع
پر صاف طور سے اظہارِ خیال نہیں کیا ہے[5]۔" اور پھر بالاختصار متقدمین پر اعتراض کرنے کے بعد تعددِ محرکین پر یہ دلیل پیش
کی ہے کہ کائنات کی روزمرہ گردش کا باعث تو ابتدائی غیر متحرک جوہر ہے لیکن اس سادہ گردش کے علاوہ ستاروں کی کچھ ازلی
گردشیں اور بھی ہیں لہٰذا ہر ستارے کی گردش کا باعث ایک علٰحدہ اور ازلی جوہر کو ہونا چاہیئے۔ چونکہ ثوابت و سیار ازلی اور ابدی
جواہر ہیں لہٰذا اُن کو حرکت میں لانے والے بھی ازلی بلکہ اُن سے قبل ہیں اور چونکہ جوہر سے قبل صرف جوہر ہو سکتا ہے بنا بر ایں
ستاروں کی جتنی گردشیں ہیں اتنے ہی اُن ستاروں کو حرکت میں لانے والے جواہر ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں غیر متحرک ہیں اور جسم و جسمانیت
سے مبرا ہیں۔

اس دلیل کے بعد ارسطو نے ہیئت کے دو ماہروں یعنی یوڈوکسس اور کیلیپس کے اقوال سے استناد کیا ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے

---

[1] A History of Philosophy By Thilly p. 110
Aristotle By Ross page 184 etc.

[2] Metaphysics page 342 Foot Note 6

[3] The Philosophy of Aristotle By Allan p. 122

[4] A History of Western Philosophy page 250

[5] Metaphysics page 354

کہ ان غیر متحرک محرکین کی تعداد ۴۷ ہے یا ۵۵ [1]۔

پروفیسر برٹرنڈ رسل کے قول کے مطابق ارسطو نے کہیں بھی اس بات کی تشریح نہیں کی ہے کہ ان سینتالیس یا پچپن جواہر یا عقول کا خدا سے کیا تعلق ہے اور پروفیسر موصوف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ تعددِ محرکین کے عقیدے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ارسطو خدا کے علاوہ سینتالیس یا پچپن اور خداؤں کا بھی قایل تھا [2]۔

لیکن تعددِ الٰہ کے اس عقیدے کا قایل ہونے کے باوجود چونکہ ارسطو ہی وہ پہلا اور شاید آخری یونانی فلسفی تھا جو خدا کو کائنات سے علٰحدہ سمجھتا تھا اس لئے اُن مذاہب نے جو تخلیق کے اعتقاد کی وجہ سے خدا اور کائنات کو جدا سمجھتے تھے ارسطو کے اس نظریہ کو کہ خدا کائنات سے علٰحدہ ہے بنظرِ استحسان دیکھا اور ان مذاہب کے فلاسفہ نے شعوری اور غیر شعوری طور سے ارسطو کو دوسرے فلاسفۂ یونان کے مقابلہ میں یہاں تک بڑھایا چڑھایا کہ وہی ارسطو جیسے مسلمان فلاسفہ سے قبل افلاطون کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا مسلمان فلاسفہ کی شرح کی وجہ سے نشاۃ جدیدہ تک یورپ کے افکار پر چھا گیا [3]۔

(باقی)

---

[1] Metaphysics pages 354-356
[2] A History of Western Philosophy page 191
[3] Ibid page 306

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی قیمت سات روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- **کتابستان - الہ آباد**

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے آغازِ عشق سے انجامِ عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُن کے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم و تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحلِ محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش و دلفریب اضافہ ہے۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

رعایتی اعلان

من و یزداں - مذہبی استفسارات و جوابات - نگارستان - للعہ ۸ عہ ۸ عہ

جمالستان - مکتوباتِ نیاز تین حصے - الٰہ و ما علیہ - عہ ۵ عہ ۱۲ عہ

مذہب - حسن کی عیاریاں - شہاب کی سرگزشت - عہ عہ عہ

مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم - قول فیصل - ۳ عہ عہ

فراست الید - نقاب اُٹھ جانے کے بعد - عہ ۸

میزان

عہ ۵۲

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف پینتالیس روپئے میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

رشید احمد صدیقی

(محمد عظیم)

ڈاکٹر عبدالحق نے رشید صاحب کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا تھا کہ:- "جن میں بننے کی صلاحیت ہوتی ہے ان میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں" یہ عرصہ دراز کی بات ہے۔ ممکن ہے اس وقت ڈاکٹر صاحب کو رشید صاحب میں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ کچھ غلط قسم کے رجحانات بھی محسوس ہوئے ہوں اور ان کی بنا پر انھیں یہ اندیشہ ہوا ہو۔ لیکن آج رشید صاحب یقیناً اس مقام پر ہیں (خود اپنے الفاظ میں) کہ "نامعقول بات بھی کہیں تو داد کے مستحق ٹھہریں" قدرت نے انھیں کچھ ایسی تاثیر بیان بخشی ہے کہ بعض دفعہ ان کی بے معنی باتیں بھی بڑی بامعنی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی دلآویز شخصیت، ان کی خیال آفرینی ظرافت اور ان کا شگفتہ اندازِ بیان کچھ ایسی افسانہ وافسوں کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے نہ صرف اپنی عقل وادراک سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی رفاقت میں عقل وادراک بجائے خود چھوٹی چیزیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یونتو وہ صفِ اول کے نقاد بھی ہیں اور ایک صاحبِ طرز ادیب و انشا پرداز بھی لیکن ان کے اصل جوہر طنز و ظرافت میں کھلتے ہیں اور ان کی مرقع نگاری میں جو غیر معمولی سطوت اور برگزیدگی، دلآویزی اور سحر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے اس میں بھی بڑی حد تک ان کی یہی شوخ اور سنجیدہ شخصیت کارفرما رہتی ہے۔ رشید صاحب کے نزدیک زندگی عبارت ہے خوشدلی اور خوش باشی سے[1] اور یوں ان کے لئے مروت، انسانیت، شرافت، حوصلہ پروری، خدمت اور ایثار زندگی کی کتنی ہی اہم قدریں کیوں نہ ہوں، لیکن ان کے نظریۂ حیات کی اصل اساس یہی زندہ دلی اور خوش باشی ہے اور وہ حق اور انصاف، خدمت اور ایثار کا بھی صرف اسی حد تک ساتھ دیتے ہیں جہاں تک کہ ان کا نظریۂ حیات انھیں اجازت دیتا ہے، ان حدود سے متجاوز ہونا، ان کے نزدیک اور علی گڑھ کے لئے بدمذاقی کا ثبوت دینا ہے علی گڑھ ان کی تحریر و تقریر میں، کردار و شخصیت میں جس حد تک دخیل ہے اور جتنا اور جیسا پروپاگنڈا یونیورسٹی کا انھوں نے کیا ہے، یونیورسٹی کے بانی سے لیکر آج تک، کسی فرد واحد کا تو ذکر کیا، بحیثیت مجموعی تمام افراد کو بھی یہ شرف نہیں پہونچتا۔ ان کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ ان میں جتنی انسانی فضیلتیں، خوبیاں اور خامیاں ہیں وہ سب علی گڈھ کی دین ہیں، گو انھیں یہ اصرار ہے کہ ان کی خوبیوں میں علی گڈھ کا ہاتھ اور خرابیوں میں خود ان کی ذات کارفرما ہے۔ اس لئے ان کو سمجھنے کے لئے خود علی گڑھ کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔

یونیورسٹی کے حالات و کوائف، اس کی تاریخ، اس کے کھیل کود کے مشاغل، اس کے بلند عزائم، اس کی یونین کا شور و شغب، اس کا علمی اور سیاسی انہماک، ان سب امور پر علیگ اور غیر علیگ سب ہی نے روشنی ڈالی ہے۔ اور ان سب میں علیگڈھ کے اس "مہاپرش" (رشید صاحب) کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس لئے ہم انہی کے بیانات کی روشنی میں علی گڑھ کا جایزہ لیں گے۔ علی گڑھ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں علی گڈھ بہت ہوتا ہے۔ میری اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے لگے ہیں۔

---

[1] "سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جو جی میں آئے کہ گزرنے کے ہیں نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آگئے۔ انگیٹھی سرد ہونے لگی نوکر نے کوئلے ڈال دئے۔ نہ اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے۔ جی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے" یہ ہے آئیڈیل زندگی کا نقشہ رشید صاحب کے نزدیک۔

ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے۔ وہ یہ کہ وہ خود علی گڈھ سے کیوں نہیں واقف ہیں۔ اُردو جاننا اور علی گڈھ سے واقف نہ ہونا، بجائے خود کسی فتور یا فقدان کی علامت ہے۔ اُردو کا ایک نام علی گڈھ بھی ہے۔

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند، ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار، فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی شخصیت کہہ سکتے ہیں سب کی سب علی گڈھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لئے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت، صورت و معنی علی گڈھ نے دی۔ اگر میں علی گڈھ نہ آتا اور میری صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا جو علی گڈھ کہلاتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے وہ صلاحیتیں (کل نہیں تو اکثر) مفید ہونے کی بجائے میرے اور دوسروں کے لئے مضر ثابت ہوتیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں۔ لیکن یہ کمزوریاں علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں۔ میں ان کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ علی گڈھ کی پیدا کی ہوئی مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔

حال ہی میں ایک اہم موقع پر جہاں فضلائے عظام کا مجمع تھا۔ مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ میں نے لکھنے کا انداز کہاں اور کیونکر پایا معلوم نہیں کیوں اور کیسے بے اختیار یہ فقرہ میری زبان پر آیا "علی گڈھ نے دیا"۔ تفصیل کسی نے نہیں پوچھی۔ مطمئن سب ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ میرا دل کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں لگتا تھا۔ میں دراصل علی گڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آیا تھا جتنا علی گڑھ کے کھیل نیز اس کی عام وقعت و وقار کا چرچا سن کر۔

کالج کا جو نقشہ ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے اور جن حالات و حوادث سے میں دوچار ہوا اس نے نہ صرف میرے سوچنے سمجھنے اور اسالیب تحریر کو متاثر اور متعین کیا بلکہ جدید اُردو شعر و ادب کو زندگی اور زمانہ کے اہم تقاضوں سے آشنا اور عہدہ برا ہونے کے بھی قابل بنایا۔ بالفاظ دیگر جدید اُردو شعر و ادب کے بیشتر اصناف و اسالیب علی گڑھ کے لکھنے والوں کے دئے ہوئے ہیں اور اُردو کی تمام تقریباً صحت مند اور ترقی پذیر تحریکات کا پیامبر علی گڑھ رہا ہے"۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ ہو گئی تھی اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ حکومت ان کے ہاتھ سے کیا گئی گویا زندگی نے ان سے منہ موڑ لیا، جان کام آئی۔ زمین اور جاگیریں ان کی ضبط ہوئیں۔ ملازمت سے برطرف کر کے مقدمات ان پر چلائے گئے۔ —— انصاف کیسا، صرف مسلمان ہونا ہی غدار اور مجرم ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ مفلسی اور ناداری نے الگ اخلاقی انحطاط پیدا کیا۔ غرض معاشی معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے پوری قوم کی حالت اس یتیم اور آوارہ لڑکے کی مانند ہو گئی تھی جس کا کوئی سرپرست ہو اور نہ کوئی فریادی — جسے یہ معلوم ہو کہ وہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ سید احمد خاں نے ان تمام حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے حساس دل پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن ملک کو چھوڑنے سے ملک کی حالت تو نہیں سدھر سکتی تھی اس لئے انھوں نے ملک و قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب ان کے نزدیک مسلمانوں کی جہالت تھی لیکن کالج کے قیام سے ان کا مقصد محض انھیں تعلیمیافتہ بنانا نہ تھا بلکہ اسے وہ ان کی تمام اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی تحریکات کا مرکز بنا دینا چاہتے تھے۔ کالج سے ان کے مطمح نظر کی کہاں تک تکمیل ہو سکی، اس پر روشنی ڈالنا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کالج کی وجہ سے انگریز اور مسلمانوں کی باہمی نفرت اور غلط فہمی ضرور دور ہوئی۔ کامیاب طلباء کے لئے رزق کے دروازے کھلے، اور انھیں حکومت کرنے یا حکومت کا پرزہ بننے کا موقع بھی ملا۔ لیکن انگلستان سے میل اور یگانگت بڑھانے سے سرسید کا جو اصل مشن تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ ان کی مستعدی اور جفاکشی، ان کا ایثار، ان کی بلند نظری اور بلند کرداری، علم و فن کے لئے ان کی سچی لگن، حقیقت سے آنکھیں چار کرنے اور حالات کو اپنے عزائم کے مطابق ڈھالنے کے لئے انتھک جد و جہد کا شعور نہ مسلمانوں کو آنا تھا نہ آیا۔ ہاں ان کی ظاہری نمود و نمائش، ان کی خوش پوشی اور خوش بیانی اپنی شخصیت اور کارناموں کو نمایاں کرنے کے لئے پروپیگنڈا، ہوا کے رخ کو پہچاننے اور اس کے مطابق چلنے کا سلیقہ ضرور ان میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اگر آپ "مضامین رشید" یا ان کی

"آشفتہ بیانی" کا مطالعہ کریں تو یہاں آپ کو علی گڑھ کے طلباء کی نفسیات، ان کے مشاغل اور ان کے ذہنی اور فکری رجحانات کی بڑی واضح تصویر نظر آئے گی۔ وہی خوش گپیاں وہی چہل پہل، وہی اپنے حریف کو ہر قیمت پر شکست دینے کے حوصلے، وہی کھیل کود کے ہنگامے، وہی شعر و سخن کے چرچے، وہی جھوٹی امارت اور ظاہری شان و شوکت کے مظاہرے جو مسلم معاشرت اور مسلم ذہنیت کا طرۂ امتیاز ہیں، یہاں پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کو نظر آئیں گے۔ وہ علمی انہماک جو ایک طالب علم یا پروفیسر کا واحد شغل حیات اور مقصدِ حیات سمجھا جاتا ہے۔ کردار کی وہ پختگی یا اپنے نصب العین سے وہ شدید وابستگی جو انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے، اس کا یہاں کوسوں پتہ نہیں۔ رشید صاحب کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ ان کے کردار اور شخصیت کو جلا اور ایک خاص رنگ و آہنگ علی گڑھ نے بخشا۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ ان کی خوبیاں علی گڑھ کی اور خامیاں انکی اپنی ہیں، اس خطیب یا مقرر کی موقع شناس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جو اپنے سامعین کے مذاق و میلان کو مدنظر رکھ کر اپنے لب و لہجہ اور نہجِ فکر کو متعین کرتی ہے (میں نے مصلحتاً ایسا کہا ہے ورنہ مجھے کہنا چاہئے تھا کہ یہ علی گڑھ کی اس مخصوص فضا اور ذہنیت کی آئینہ دار ہے جو Buttering کو ایک خاص اہمیت دیتی اور اسے حربہ کے طور پر استعمال کرتی ہے) ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں تمام تر علی گڑھ کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ ان کے دماغ کی تیزی اور طراری، ان کا اندازِ فکر، ان کے اسلوبِ بیان کی رعنائی اور شگفتہ کاری ان کی نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی ان کی شرافت اور شائستگی، علی گڑھ ہی کے مخصوص ماحول اور فضا میں پروان چڑھ سکتی تھیں۔ اسی طرح علی گڑھ کی رجعت پرستی، تن آسانی، علم کے لئے سچی تڑپ کی بجائے علمیت کی نمائش اخلاق اور انصاف کا ایک مخصوص تصور کبھی کبھی رشید صاحب میں بھی جھلکنے لگتا ہے۔

آپ نے بعض خاندان یا خاندان کے بعض افراد کو دیکھا ہوگا کہ ان میں آپس میں بظاہر بڑا میل جول محبت اور یگانگت نظر آتی ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کی عظمت، خلوص اور شرافت کا معترف معلوم ہوتا ہے لیکن کبھی آپ کو انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے دل کو ٹٹولنے کا موقع ملے تو آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ان کی بظاہر محبت اور احترام کے پردے میں ہزاروں بے اعتمادیاں اور شکر رنجیاں چھپی ہوئی ہیں اور دل سے کوئی بھی کسی کی عظمت اور برگزیدگی کا قایل نہیں۔ کچھ ایسا ہی حال رشید صاحب کا بھی ہے۔ یونیورسٹی سے متعلق ان کے عام خیالات اور تاثرات آپ کی نظر سے گزریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ یونیورسٹی کی جتنی قدر و منزلت ان کی نظروں میں ہے کسی اور کی نظر میں نہ ہوگی۔ لیکن اپنے بلند بانگ دعووں سے گزر کر، جب وہ سنجیدگی سے یونیورسٹی کے بعض کارناموں کا جایزہ لیتے ہیں تو پھر یونیورسٹی کی ساکھ ان کی نظروں میں گر جاتی ہے اور یہ سرچشمہ فیض و علم خشک ہو کر رہ جاتا ہے اس مضمون کی ابتدا میں علی گڑھ سے ان کی وابستگی اور عقیدتمندی کا اظہار آپ کی نظر سے گزرا۔ اب ذرا جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی کارکردگی کا جایزہ لیتے ہوئے یونیورسٹی کی جو قدر و قیمت ان کی نظر میں رہ جاتی ہے اسے بھی ملاحظہ فرمایئے :-

"جامعہ اور مسلم یونیورسٹی دونوں کو اپنے اپنے اختیار کئے ہوئے راستوں پر بڑھنے کا زمانہ ایک ہی ہے سب جانتے ہیں کہ دشواریوں کے باوجود قوم اور ملک میں جامعہ نے اپنی ساکھ قایم کی اور مسلم یونیورسٹی نے سہولتوں کے ہوتے ہوئے اپنی ساکھ کھوئی ..... واقعہ یہ ہے کہ کارکنان جامعہ نے جس ایثار و استقامت کا ثبوت دیا وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو جامعہ کی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مسرت سے یاد رکھا جائے گا۔ ان باتوں کے باوجود ہم پر جو نئی اور نہایت درجہ اہم ذمہ داریاں یونیورسٹی کی طرف سے عاید ہوتی تھیں، ان کا حق ہم ادا نہ کر سکے"

شاید آپ یہ سوچیں کہ ان کے نزدیک یونیورسٹی کی یہ بے وقعتی نتیجہ ہے جامعہ اور یونیورسٹی کے موازنہ کا۔ اصل بات یہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی نے اپنی ابتدا سے لے کر آج تک کبھی ان توقعات کو پورا نہیں کیا جو رشید صاحب یا دوسرے اہلِ علم نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں رشید صاحب ہی کی زبان سے سنئے :-

"میرا خیال ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جب سے یونیورسٹی ذاکر صاحب کی قیادت میں آئی اس پر وہ نقش و نگار ابھرنے لگے ہیں

جو مدرسۃ العلوم اور اس کے بانی کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً ایک تہائی صدی تک ایک گونہ بے ثمرہ کہ اس ادارہ میں برگ و بار کے آثار تیزی سے پیدا ہونے لگے ہیں"۔

مذکورۂ بالا عبارت سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک یعنی یونیورسٹی کے قیام سے ذاکر صاحب کے وائس چانسلر بننے سے پہلے تک اس یونیورسٹی نے کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اور اب رشید صاحب کا یہ خیال کہ اس ادارہ میں برگ و بار کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں محض خوش فہمی پر مبنی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ سے ذاکر صاحب کو جیسا اشتراک اور تعاون ملا، اسے ذاکر صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا لیکن ہم اتنا محسوس کرتے ہیں کہ ذاکر صاحب کے اس سات آٹھ سال کے مختصر دور میں وہاں کی عام ذہنیت کوئی حیات انگیز انقلاب نہیں ہوا اور اگر رشید صاحب کو کوئی تبدیلی نظر آتی ہے تو یہ محض شکست خوردہ ذہنیت کی کارفرمائی ہے۔

علی گڈھ میں جوہر قابل کی کبھی کمی نہیں رہی۔ طلبا میں نہ سہی، وہاں کے اساتذہ میں ایک سے ایک بڑا افلاطون موجود رہا ہے لیکن قربانی اور ایثار کے مادہ کی کمی اور مطمحِ نظر کی پستی نے اُن کے تمام علم و فضل پر خاک ڈال دی ہے۔ تحریک عدم تعاون میں رشید صاحب نے اپنے مرشد کے ساتھ عدم تعاون کیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کے سامنے اپنی کچھ مجبوریاں تھیں لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ تحریک آزادی اور اس کے علمبرداروں کا وہ کس بے دردی سے 'مضامین رشید' میں مذاق اڑاتے ہیں اور ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہی گاندھی جی جو کبھی ان کے نزدیک "مارسڈن ہسٹری کے ٹھگ" سے مشابہ نظر آتے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی نظر میں ہندوستان کے پیغمبر بن بیٹھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا فقط نظر کی یہ تبدیلی رشید صاحب میں علمی اور سماجی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے یا اسے ان کی موقع شناسی پر محمول کیا جائے۔ قصور دراصل رشید صاحب کا بھی نہیں۔ برہمنگی اس حمام (یونیورسٹی) کا عام دستور رہا ہے۔

سرور صاحب نے "ضیائے حیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ڈاکٹر ضیاء الدین کے اثر سے کتنی ہی نسلوں کے سینے بے نور ہو گئے۔ کتنوں کے دلوں میں حریتِ فکر کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہی۔ کتنے ہی سستی سیاست اور وقتی ہنگاموں کے شکار ہو گئے ..... انھوں نے قوم کے اخلاق اور سیرت کو تباہ کر دیا۔ کتنے ہی اساتذہ علم و فضل کے راستے سے مایوس ہو گئے۔ کتنے ہی طلبا مطلب پرست، اپنا کام نکالنے والے، تنگ نظر اور پست ہمت ہو گئے۔ کتنوں کے نزدیک لوگوں کی آنکھ میں خاک جھونکنا اور اپنا الو سیدھا کرنا مسلک زندگی قرار پا گیا۔ کتنے ذاتی صلاحیت پیدا کرنے کی بجائے سفارشی خطوط کے عادی ہو گئے...

.... یونیورسٹی کا مقصد ان کے نزدیک سرکاری ضرورتوں کو پورا کرنا اور نظامِ حکومت کے لئے کارآمد پرزے مہیا کرنا تھا"۔

یہ ڈاکٹر ضیاء الدین پر محض اتہام ہے۔ وہ یونیورسٹی کے سچے نمایندے تھے اور ایم اے او کالج کے صحیح تربیت یافتہ طالب علم۔ انھوں نے یونیورسٹی کے عام ماحول و میلان کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

اب رشید صاحب کے اس قول کے متعلق کہ "اردو کا ایک نام علی گڑھ بھی ہے" ذرا سرور صاحب کی رائے بھی سن لیجئے:۔

"اردو بہت دن تک علی گڈھ کا وظیفۂ لب رہی۔ دل کی دھڑکن نہ بن سکی۔ علی گڈھ والوں نے اردو کے اصلی اور حقیقی منصب کو کبھی نہ پہچانا"

رشید صاحب کو مرقع نگاری میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ اس صنف میں یوں تو کئی کتابیں قابلِ ذکر ہیں لیکن گنجے فرشتے، گنجہائے گرانمایہ، صاحب اور چند ہم عصر خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان سب کا زاویۂ نگاہ یکساں نہیں، مختلف ہے۔ لیکن ہر ایک اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور انداز بیان کی وجہ سے ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ گنجے فرشتے کے کرداروں میں واقعیت کتنی اور افسانویت کس قدر ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یوں بھی ہر حقیقت کو افسانہ بنا دینا منٹو کا خاصہ ہے اور اپنے کرداروں کو برہنہ کر کے دیکھنا دکھانا ان کا محبوب مشغلہ۔ لیکن جتنی شخصیتیں انھوں نے پیش کی ہیں، قائدِ اعظم جناح یا ایک دو کو اور چھوڑ کر سب سے ہمیں گھن آنے لگتی ہے۔ منٹو اسی کو حقیقت نگاری کی معراج سمجھتے تھے اور انھیں اس پر ناز تھا کہ انھوں نے ہر ایک کا بڑی خوبی سے "مونڈن" کیا ہے۔ اس کے بالکل برعکس کیفیت رشید صاحب کی ہے۔ جن شخصیتوں کے

چہرہ سے انھوں نے نقاب اُٹھایا ہے وہ حقیقتاً قابلِ پرستش ہوں یا نہ ہوں وہ ان سے اس قدر محبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی شخصیتوں کو اس قدر بنا سنوار کر ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ ہمارا جی چاہنے لگتا ہے، کاش ہم بھی رشید صاحب کے دوست ہوتے۔ ان دونوں بہترین طفیل صاحب کی "صاحب" ہے جیتی جاگتی چلتی پھرتی ہستیوں کے مرقعے — جن میں ہماری کمزوریاں بھی ہیں اوصاف بھی ہیں لیکن طفیل صاحب کا مشاہدہ اتنا حقیقت انگیز اور ان کا اسلوب اس قدر سادہ اور پرکار ہے کہ ہماری جانی بوجھی ہستیاں بھی کچھ کچھ نئی اور انوکھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے یا ہم ان سے ہمیشہ کے لئے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ جہاں بلند اوصاف کی ستائش کرتے ہیں وہاں ان کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز بھی ہوتے اور ہمیں ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کے بعض ان خصائص سے روشناس ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے جو ابھی تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ عبدالحق صاحب بزرگ ہیں۔ ان کا زاویۂ نگاہ بڑا حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ بڑی سے بڑی ہستی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے اور جب معمولی آدمیوں میں بھی انھیں اعلیٰ صفات نظر آتی ہیں تو وہ ان کے بھی گن گانے لگتے ہیں۔ سادگی، انسانی ہمدردی، محنت، جفاکشی اور فرض شناسی ان کے نزدیک بڑی اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ جب اور جہاں کہیں انھیں نظر آتی ہیں۔ اس کے برخلاف رشید صاحب جن قدروں پر ایمان رکھتے ہیں اگر وہ ان کے دستوں اور عزیزوں میں بھی نظر آئیں تو وہ ان کے لئے اور بھی عزیز تر ہو جاتی ہیں۔

رشید صاحب کا نقطۂ نظر محض موضوعی ہے۔ وہ کسی شخصیت کا اپنی شخصیت سے ہٹ کر جائزہ نہیں لے سکتے۔ ممکن ہے زیرِ نظر شخصیت کے بعض گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جائیں لیکن وہ خود ضرور بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انھیں اس سے بحث نہیں کہ کون سے پہلو زیادہ اہم اور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ وہ تو انھیں صفات کا اپنے مخصوص رنگ میں تذکرہ کرتے ہیں جن سے وہ خود متاثر ہوئے ہوں مولانا سلیمان ندوی پر ان کے مضمون کا موازنہ سر شاہ محمد سلیمان والے مضمون سے کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جذبات و تاثرات کو کتنا دخل ہے۔ انھیں جذبات کے سہارے وہ اپنے ممدوح کی ایسی بے مثال تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ آپ کو اس پر بے اختیار پیار آنے لگے۔

"میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے۔ کمرہ چھوٹا تھا۔ دروازے بند اور روشنی مدھم۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بلحظہ سمٹتی جا رہی ہیں۔ دراز قد، متوسط جسم، متھری اور خوش وضع پوشاک، سر پہ پٹے، سڈول بھری بھری فرنچ کٹ داڑھی، سر پہ بالوں کی اونچی ٹوپی چہرہ پر اُجالا آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت، متوسط عمر، انداز میں خود اعتمادی اور دل آسائی۔ بیک نظر دل نے گواہی دی کہ ایک اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔"

نازک اور لطیف کیفیات کی مصوری اور ایسے حسین اور لطیف ترانداز میں گویا جذبات نے خود کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال لیا ہو، رشید صاحب کا خاصہ ہے۔ یہاں آپ کو قدرت بیان کی نمایش ملے گی اور نہ خطابت کا جوش و خروش بلکہ ایک ایسا معصوم اور شایستہ اندازِ بیان جو انتہائی فطری ہونے کے باوجود انتہائی رنگین اور پرکار بھی ہے۔ بعض دفعہ بچوں کی باتیں سن کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں جو تاثیر، بلاغت اور دل نشینی پائی جاتی ہے، بڑے سے بڑے قادر الکلام خطیب اور شاعر بھی اس سے محروم ہیں۔ کچھ ایسی ہی دل آسائی اور معصومیت اکثر رشید صاحب کے ہاں ملتی ہے جذبات کا وہ رچا ہوا سوز و گداز جو ہمارے دل میں جانے کیسی کیسی دنیائیں تعمیر کرتا بگاڑتا اور بناتا ہے اور اسی کے ساتھ فکر کی وہ ہلکی سی چاشنی جسے جذبات سے مزین کرنا دشوار ہے، ان کا اسلوب کچھ ایسے تناسب اور صنعت سے بروئے کار لاتا ہے کہ ہمیں ان کی انسانیت اور عظمت کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں خطابت اور قدرتِ بیان کی تابناکی نہیں ملتی، ملتی ضرور ہے لیکن اس سے کہیں بلند تر اور کیف انگیز ان کے اسلوب کی وہ فضا ہوتی ہے جس میں زورِ بیان سے زیادہ دل سوزی کو دخل ہوتا ہے۔ گنج ہائے گرانمایہ کی مقبولیت کا سبب ان کا یہی اسلوب اور ان کے اس اسلوب کا شاہکار گنجہائے گرانمایہ ہے۔

ظرافت رشید صاحب کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ یوں تو وہ اپنے دلچسپ اور منفرد اندازِ بیان، تنقید اور مرقع نگاری کے لئے خاصی شہرت رکھتے ہیں لیکن طنز و مزاح ان کے خمیر میں کچھ اس قدر داخل ہے کہ وہ خواہ کسی موضوع پر خامہ فرسائی کریں جب تک اپنے اس

طبعی رجحان کا مظاہرہ نہ کرلیں انھیں خود تسکین نہیں ہوتی۔ مقامی رنگ کی زیادتی کی وجہ سے بعض اشخاص مضامین رشید سے کچھ زیادہ لطف اندوز نہیں ہوتے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مضامین رشید اور گنجہائے گرانمایہ ہی ان کے اصل کارنامے ہیں۔ ان کی تمام کتابیں دوسروں کی فرمائش یا ضرورت کے تحت لکھی گئی ہیں۔ مضامین اور گرانمایہ ہی ان کی دو ایسی غزلیں ہیں جن کی زمین، ردیف اور قافیہ سب کچھ رشید صاحب کا منتخب کیا ہوا ہے۔ یہاں ان کا ذوق و شوق، ان کے دوست احباب کی بزم آرائیاں، ان کے دن رات کے مشغلے، غرض وہ سب کچھ جن سے رشید اور ان کی زندگی عبارت ہے پوری تابناکی اور فراوانی کے ساتھ آپ کو نظر آئے گا۔ خنداں میں مضامین رشید کے مقابلہ میں زیادہ تنوع اور وسعت ہے۔ یہاں مقامی رنگ کی بھی افراط نہیں زبان بھی کس قدر سادہ اور سلیس ہے۔ لیکن ریڈیائی پابندیوں کی وجہ سے ان کی طبیعت کی وہ آزاد روانی نظر نہیں آتی جو 'مضامین' کا حصہ ہے۔ ممکن ہے یہ کچھ عمر کا بھی تقاضہ ہو۔ بہرحال مضامین رشید کے مضامین میں جو دم خم اور توانائی نظر آتی ہے وہ خنداں میں نہیں ملتی۔ ہاں خنداں ان کی اس تنگ نظری اور رجعت پسندانہ خیالات سے ضرور پاک ہے جو مضامین رشید میں گراں گزرتے ہیں اور جن سے کبھی کبھی عالمانہ اور بالغ شعور کی بجائے محض ایک کھلنڈرے طالب علم کی ذہنیت مترشح ہوتی ہے۔

رشید صاحب کی تنقیدات پڑھتے وقت دو باتیں خاص طور پر محسوس ہوتی ہیں ایک ان کی ذہانت اور دوسرے مطالعہ اور محنت کی کمی جس پر وہ اپنی خوش طبعی اور شگفتہ نگاری کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے نزدیک اسلوب کی بڑی اہمیت ہے لیکن مواد اور اسلوب میں جو گہرا ربط ہے اسے وہ نظر انداز کر جاتے ہیں اور ہیئت کو مواد پر مقدم سمجھنے لگتے ہیں۔

"اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جہاں تک خیالات یا حسیات کا تعلق ہے ہمارا سرمایہ محدود ہو چکا ہے۔ ہاں جو چیز لامتناہی ہے وہ طرز بیان ہے۔"

حیرت ہوتی ہے کہ جو نقاد انگریزی ادب اور اقبال کا مزاج داں رہا ہو وہ کیونکر ایسا خیال ظاہر کر سکتا ہے۔ اس سے جہاں ان کی اسلوب بیان سے غیر معمولی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے وہاں ان کی محدود نگاہی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں رشید صاحب کے مذاق اور شعور کی تشکیل میں غزل کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ شاعر نہ سہی، غزل کے انشا پرداز ہیں۔ اس ایک جملہ میں ان کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹ آتی ہیں۔ وہ غزل کی بلاوجہ اتنی تعریف نہیں کرتے، غزل ان کا مزاج ان کی زندگی ہے۔ اپنے ایک شعر سے جو غزل گو جو اثر مرتب کرنا چاہتا ہے، رشید صاحب اپنے ایک جملے سے وہی کام لینا چاہتے ہیں اور جب انھیں یہ جملہ سوجھ جاتا ہے خواہ وہ کسی عالم میں ہوں، سر جائے یا رہے، وہ کام کے رہیں یا نہ رہیں، ہر کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو زبان کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ ان سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن سنجیدہ طبیعتیں اس سے منغض ہوتی ہیں۔ کلیم الدین کو ان میں اسی لئے ذہنی کمزوری نظر آتی ہے، لیکن کلیم الدین صاحب کو اس کا احساس نہیں کہ ان کی یہ کمزوری اکثر فطری نہیں ہوتی بلکہ اس میں ان کی ذہانت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ جب کوئی مشکل مقام آتا ہے جہاں جگر کاوی یا دماغ سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا جہاں واضح نقطۂ نظر کا اظہار کرنے سے اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا ہونے لگتے ہیں وہ اپنی اسی "مخصوص غزل" کا سہارا لیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں رشید صاحب بہک گئے، وہ بہک گئے یا آپ کو بہکا دیا اس پر آپ کی نظر نہیں پڑتی۔ دیوانگی میں یہ فرزانگی علی گڑھ کا فیضان ہے۔

رشید صاحب کی ناقدانہ بصیرت غزل یا متغزلانہ شاعری تک محدود ہے، اور اس میں بھی وہ نیاز فتحپوری یا ضیاء احمد بدایونی کی ژرف نگاہی کو نہیں پہونچتے۔ نئے تجربوں سے وہ بھڑکتے تو نہیں، لیکن قدر و قیمت جاننے کے لئے جس وسعت نگاہ، تحمل اور ہمدردی کی ضرورت ہے، وہ پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کے ادبی شعور کی پختگی کے بعد اردو ادب میں ادب لطیف اور ترقی پسند دو ادبی تحریکوں نے جنم لیا۔ دونوں ہی کی انھوں نے مخالفت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب لطیف سے وہ غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اپنے قدیم سرمائے سے وابستگی اور قناعت نے ان میں کچھ ایسا احساس برتری پیدا کر دیا ہے کہ وہ آئین نو سے ڈرتے تو نہیں لیکن طرز کہن پر اڑنے کے لئے ضرور وضع جواز پیدا کر لیتے ہیں۔

ان کے اکثر تنقیدی اور غیر تنقیدی مضامین میں یہ بحث دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک شریف انسان ہی اچھا ادیب بن سکتا ہے معلوم نہیں شرافت سے متعلق ان کا تصور کیا ہے۔ شرافت کبھی خوش لباسی اور خوش گفتاری کا مترادف ہوتی ہے اور کبھی اس کا تصور مولانا حسرت موہانی کی شخصیت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ پھر رشید صاحب کو اس کا احساس نہیں کہ غیر معمولی انسان اکثر نامعقول ہی ہوئے ہیں۔ اگر ادب کی برتری انسان کی شرافت اور معقولیت پر ہی منحصر ہوتی تو مولانا حالی کو یقیناً غالب پر فضیلت حاصل ہوتی۔ شیلی اور بائرن کو جانے دیجئے۔ فرانسیسی آسمان ادب کے وہ درخشندہ ترین ستارے۔ والیٹر[1] اور روسو فرشتے تھے یا خبیث ترین انسان! یہاں ادیبوں کے کام اور نام گنانا میرا مقصد نہیں۔ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ ایک ادیب کے لئے انفس و آفاق کی حقیقت شناس نظر کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کا حامل ہونا بہت ضروری ہے۔ شرافت اور معقولیت تو محض اضافی قدریں ہیں البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ادیب کے خیالات اس کی شخصیت کے سانچے سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اس لئے ایک ادبی تخلیق اپنے خالق کے عادات و خصایل اور اس کی شرافت و دنائت سے ضرور متاثر ہوتی ہے اور بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا مصنف ہوگا ویسی ہی اس کی تصنیف بھی ہوگی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شخصیت ایک پیچیدہ اور مرکب عمل ہے اور اس کی بالیدگی جتنی متضاد کیفیتوں اور صلاحیتوں کی تسکین اور ان میں باہمی توازن پر منحصر ہے اتنی انسان کی شرافت اور نیکی کی مرہون نہیں۔ حالی پر غالب کی برتری کا اصل راز یہی ہے۔ اس کے علاوہ ادب ایک آئینہ تو ہے ادیب کی شخصیت کا، لیکن یہ ایک ایسا کیمرہ نہیں ہے جو لازمی طور سے اس کے ظاہر و باطن کی تمام و کمال تصویر کھینچ دے۔ ادیب ایک باشعور ہستی ہے اور وہ تخلیق کے دوران میں اپنے جذبات کے ہاتھوں اتنا مجبور نہیں ہو جاتا کہ یہ تنکے کی طرح اسے جدھر چاہیں بہالے جائیں۔ جذبات کے انتہائی ہیجان میں بھی اسے اپنے آپ پر اتنا قابو حاصل رہتا ہے کہ وہ جتنا چاہے اپنے آپ کو ظاہر ہونے دے اور جس قدر چاہے خود کو چھپالے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے نامعقول شاعر بڑے معقول شعر کہتے ہیں۔ قول و فعل کا تضاد شاعروں کا عام شیوہ رہا ہے اور دنیا میں کم شاعر ایسے ملتے ہیں جن کی شاعری اور زندگی میں مکمل ہم آہنگی ملتی ہے۔

اقبال پرستی کے باوجود رشید صاحب میں اقبال کا صحیح عرفان نہیں ملتا۔ اقبال نے مغربی تہذیب و تمدن اور نظریۂ حیات پر اتنی مسلسل اور بے محابہ تنقید کی ہے کہ ہم اسے مغرب کا مخالف سمجھنے لگتے ہیں اور ہم میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مغرب اگر ہم سے مادی ترقی میں سبقت لے گیا ہے تو روحانی ارتقا میں ہم بھی اس سے کہیں افضل و برتر ہیں۔ حالانکہ اقبال کے نزدیک ہماری علم و عمل سے بے گانہ روحانیت خود فریبی یا خدا فریبی کے علاوہ اور کچھ نہیں[2]۔ مغرب جہاں علوم و فنون اور سائنس و فلسفہ کی غیر محدود ترقی اور مادی آسایش کی فراوانی کے باوجود سچی خوشی سے محروم ہے۔ وہاں مشرق بھی اپنے روحانی اتقا کے ہوئے "مبتلائے جذام" ہے۔ ہم اپنی روحانی سربلندی پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مادی ترقی کے بغیر روحانیت کا بھی اندروں تیرہ و تار رہتا ہے۔ اقبال کی نظر میں انسانیت کی تکمیل منحصر ہے روحانی اور مادی ہر دو قسم کی ترقی پر اور مغرب کو مشرق پر یہ فوقیت ز اصل ہے کہ اس نے ایک سمت میں تو اپنی تکمیل کر لی اور اب اسے اپنی عقلیت یا مادیت کو صرف روحانیت سے تب و تاب دینا باقی رہ گیا ہے۔ اس کے برعکس مشرق محض گفتار کا غازی ہے۔ رشید صاحب، اقبال کے اس نکتہ کو فراموش کر جاتے ہیں۔ 'پیام اقبال' میں انھوں نے اقبال کے نظریات کی جو ترجمانی کی ہے اس میں فلسفۂ خودی کی تفسیر کو چھوڑ کر، مغرب سے متعلق اقبال کی بجائے خود اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اور یہ خیالات وہی ہیں جو مشرق اور مغرب کے متعلق پڑھے لکھے طبقہ میں عام اور پر رائج ہیں۔

---

[1] والیٹر کے نزدیک دنیا میں صرف کاہل ہی برے آدمی ہوتے ہیں۔

[2] خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ (اقبال)

تنقید کے لئے جس توازن، اعتدال اور ضبط و سکون کی ضرورت ہے۔ وہ عموماً رشید صاحب میں نہیں ملتا۔ وہ محنت کے عادی نہیں، اور جس صنف، شاعر یا تحریک کے متعلق وہ ایک بار اظہار خیال کر دیتے ہیں دوبارہ دوسرے موقعوں پر اسی تحریر کو کام میں لانا چاہتے ہیں۔ ان کی اس ستم ظریفی سے جو توازن یا اصابت رائے قایم رہ سکتی ہے ظاہر ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اسے وہ چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ انھیں تو "کافر دماغ" کی عشوہ طرازیوں کے دیکھنے دکھانے ہی میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ ہر وقت ہمزاد کی طرح ان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور ایک "شکی محبوب" کی طرح ان کی نظر کو دوسرے جلووں سے محظوظ و متاثر نہیں ہونے دیتا، پھر بھی علی گڑھ کے بہترین نقاد، رشید صاحب نہیں، سرور صاحب ہیں اور سرور صاحب میں جو وسعتِ نظر، بلندیِ فکر اور نئی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت ملتی ہے اس میں علی گڑھ سے زیادہ غیر علیگ عناصر کارفرما ہیں۔

ادارۂ فروغِ اُردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور

اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر ذریعہ رجسٹری آپ کو مل جائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپئے سے کم کا نہ ہو اور محصول ڈاک بحساب ۱۵ فی صدی روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

تاریخی و ادبی کتابیں

یدِ بیضا... سید عابد علی عابد کے دلنشین ڈراموں کا مجموعہ ۵ر

سیاست الٰہیہ... امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ۔ ۸ر

ہماری داستانیں... ہماری قدیم داستانوں کی داستان ۵ر

نقوش لطیف... مرتبہ احمد ندیم قاسمی... ۷ر

جمال الدین افغانی ۵ر

انتقاد... سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۳ر

خلفائے محمد... ابو النصر شامی کی مشہور تاریخی کتاب کا ترجمہ۔ جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں اُن کا ساری دُنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے، خلفائے محمد میں اس نے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی پر دنیا جہان کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھدی ہے جو ان خلفاء پر سب سے معیاری اور مستند کتاب ہے ترجمہ بے حد سلیس ہے..... قیمت... ۸ر

شعلۂ طور... جگر مراد آبادی کا مجموعۂ کلام... ۸ر

امراؤ جان ادا... اُردو ادب میں سب سے دلچسپ اور سب سے معیاری ناول داستانِ حیات ہے... ۴ر

سرکنڈوں کے پیچھے... منٹو کی آخری کتاب ہے.. ۷ر

تاملات نیاز.. نیاز فتحپوری کے مضامین کا مجموعہ۔ ۸ر

اصحاب کہف (ڈراما)... نیاز فتحپوری... ۱ر

جانِ عالم... مٹیا برج کے واجد علی شاہ کی زندگی.. ۴ر

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا... ۳ر — غزالہ... ۲ر

خدانخواستہ... ۳ر — سودیشی ریل.. ۳ر

کُتیا... ۳ر — سانچ کو آنچ... ۳ر

سسرال ۴ر — مابدولت... ۳ر

کارٹون.. بے قاعدہ ۴ر — بابِ خاطر... ۴ر

بقراط... ۸ر — جوڑ توڑ... ۴ر

مضامین شوکت۔ ۸ر — قاضی جی (۳ حصے) فی حصہ ۳ر

غالب کے ڈرامے ۸ر — وغیرہ وغیرہ.. ۳ر

نقوش کے چند خصوصی نمبر

افسانہ نمبر۔ مجلد..... ۱۲ر

غزل نمبر۔ مجلد..... ۸ر

شخصیات نمبر ۱..... ۸ر

شخصیات نمبر ۲..... ۵ر

نمبر..... ۲ر

جعفر علی خاں اثر نقاد کی حیثیت سے

(عطا محمد شعلہ)

شعر و ادب میں جب تنقید کا سوال اُٹھتا ہے تو بہت سے اور ضمنی سوال بھی سامنے آجاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ شعر و ادب کو تنقید کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیوں ؟ - سب سے زیادہ اہم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تنقید نگار کو کن پیمانوں سے ادب کو پرکھنا چاہئے اور یہ کہ تنقید کی کسوٹی کیا ہو ؟ - اس سوال نے ہمارے ادبی افق کو بہت دنوں تک رنگا رنگ رکھا - کچھ تاثراتی طرز تنقید کے طرف دار تھے تو کچھ ادب میں محض صورت گری کے پرستار — ایسی صورت گری کہ جسے مواد سے کوئی تعلق نہ تھا - بلکہ محض ہیئت کی صورت گری - اور اس طرح وضع و ہیئت کے نئے نئے تجربات ہوئے - میراجی گروپ اس معاملے میں سب سے آگے تھا - لیکن وقت کے ظالم ہاتھوں نے اس تحریک کو روک دیا - اور اس کی نشو و نما نہ ہو پائی - کچھ لوگ مواد پر زور دیتے تھے اور اُن کے نزدیک ہیئت اور ظاہری تراش خراش کوئی معنی نہ رکھتی تھی - ان لوگوں نے مواد کو تو ہیئت پر ترجیح دی - اور خیالات کی رنگا رنگ دنیا بسائی، لیکن زبان اور ہیئت کی طرف سے بے اعتنائی برت کر وہ حسن کاری کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر رہے - انھیں میں سے ایک جماعت ایسی تھی کہ جو مواد کو سماجی پس منظر کے رشتہ میں دیکھنا چاہتی تھی اور اس طرح یہ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جانے کی ایک جست تھی - یہ جماعت تاریخی اسباب و علل کے ساتھ فرد کے محرکات شعوری کو کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنے کی خواہاں تھی جہاں اُس کی انفرادیت اجتماعیت کے تحت ہو کر رہے - یہ جماعت ترقی پسندوں کی تھی - کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو فن کو اُس کے اپنے حدود میں رکھ کر دیکھنا چاہتے تھے - یعنی ہر صنف ادب میں ایک آہنگ اور حسن پیدا کرنے کے لئے جو قیود وضع شدہ ہیں اُن کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے - لیکن ان سب مختلف النوع تحریکات کے داعیان کو بڑے پیمانے پر ہم محض دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں - ایک وہ جو مواد کو ہیئت پر ترجیح دیتے ہیں - ان ہر دو تحریکات نے دو نعرے پیدا کئے - اول الذکر نے ادب برائے زندگی کا نعرہ ایجاد کیا تو دوسرے گروہ نے ادب برائے ادب کا - اور سارے حسن کار اور ادیب و شاعران دو خانوں میں بٹ گئے - نواب جعفر علی خاں اثر دوسرے گروہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ہیں اور باوجود اپنے اس ادعا کے کہ وہ کس گروہ میں سے نہیں ان کی تخلیقات سے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ وہ دوسرے گروہ کے سرکردہ نمایندے ہیں - علم عروض - قواعد - بحور - فن اُردو زبان کی تراش خراش پر اثر سے زیادہ کسی کی نگاہ محیط نہیں ہے - اسی لئے وہ چاہے کسی گروہ کے نمایندے ہوں ہمارے ادب کے لئے فال نیک ہیں - یوں کہ ادب میں خواہ مواد کو ترجیح دیجائے خواہ ہیئت کو - یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ادب کو اگر ادب ہونا ہے اور اس میں حسن کاری کا کوئی تصور رہنا ہے تو اُسے کچھ مخصوص قواعد کا بھی پابند ہونا ہی پڑے گا - آج کے تنقید نگار وہ خواہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں ادب کے اس پہلو سے یکسر اغماض برت گئے ہیں - یہی وجہ ہے کہ گو دور جدید کے عمدہ شعراء و ادباء کی اکثریت اور اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو ادب برائے زندگی کا نعرہ لگاتا ہے، لیکن ان کی تخلیقات اعلیٰ ادبی حسن کاری کے معیار سے کہیں کہیں گر جاتی ہیں، ان میں ایک ناہمواری ہے - اور زبان کی تراش و خراش کی طرف سے ایک ایسی غفلت پائی جاتی ہے جو کسی طرح بھی ایک عظیم ادب کے شایاں نہیں کہی جاسکتی - یہ بڑے دکھ کی بات ہے - اور اگر اُردو ادب کو دنیا کے عظیم ادبی سرمائے میں کچھ اضافہ کرنا ہے تو اس پہلو سے چشم پوشی کر کے عظیم ادبی کامیابیوں کا خواب دیکھنا ناممکن ہے - اس لحاظ سے جب ہم اثر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں ایک منارۂ روشن کی طرح نظر آتے ہیں - نیاز فتحپوری کے بعد اثر ہی ایک ایسے صاحب نظر نقاد ہیں جن کی نگہ ادب کے اس پہلو پر

ہمیشہ رہتی ہے - اُن کے مضامین کے مجموعوں "چھان بین" - "اثر کے تنقیدی مضامین" اور "انیس کی مرثیہ نگاری" کی اہمیت آج اس لئے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ کوئی ناقد اس نظر سے ادب کو فنی کسوٹی پر پرکھنے والا ابھی تو ہمارے سامنے نہیں ہے - ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں کوئی پیدا ہوجائے اور اس کمی کا ازالہ ہوسکے - اُن کے مضامین کے مطالعہ سے نئے لکھنے والوں میں فن کی اس شق سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور ان کی نگاہ میں ایک ایسی ژرف نگاہی پیدا ہوتی ہے کہ جس کے بغیر ادب کا کارواں گمراہ ہوجانے کے خطرات سے دوچار ہے - فراق کے کلام پر تنقید اگرچہ کچھ تلخی لئے ہوئے ہے پھر بھی اُن کی جرأت و ہمت کی گواہ ہے - اس لئے کہ فراق جیسے مشہور و مقبول شاعر و نقاد کے کلام پر تنقید کرنا اور اس میں فنی غلطیاں بتانا کسی معمولی جرأت و ہمت کے آدمی کا کام نہیں ہے - اگرچہ وہ ایسی غلطیاں ہیں کہ عروض کا ایک ابتدائی شعور رکھنے والا بھی ان غلطیوں سے چونک پڑے گا - فراق آج شہرت کے نصف النہار پر ہیں اور کامیابی کی منزلوں کو جس تیز رفتاری سے انھوں نے آناً فاناً طے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے - لیکن ان کی اسی کامیابی اور شہرت کی وجہ سے ادب کا مبتدی غلط روی کا شکار ہوسکتا ہے اور ان غلطیوں کو اجتہاد کا درجہ دے سکتا ہے - اثر کے مضامین نے بروقت ہمیں اس خطرے سے آگاہ کیا - جس کے لئے ہر باذوق انسان کو اُن کا شکر گزار ہونا چاہئے - اس سلسلہ میں جہاں فراق کے ہاتھوں سے متانت اور تہذیب کا دامن چھٹ گیا وہاں اثر بھی اس خار زار سے اپنا دامن سلامت نہ لے جاسکے - ان کی زبان پر تلخی - دل میں کسیلاپن اور لہجے میں درشتی ہے - کاش وہ ذرا زیادہ سنجیدگی سے کام لیتے -

سُنا ہے کہ فراق کچھ ایسے عیوب کا بھی شکار ہیں جو سماج کی روایتوں کی رو سے قابل تعزیر ہیں ——— اُن معائب کی طرف اثر نے اشارہ کیا ہے - اشارہ ہی نہیں بلکہ کھل کر کہا ہے - اور میں معافی چاہوں گا اگر یہ کہوں کہ اس حمام میں وہ بھی ننگے ہوگئے ہیں - نصیحت کرنے کا یہ طریقہ آج کی مہذب دنیا میں قطعاً نامحبوب اور نامناسب ہے - میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک سنجیدہ انسان ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی طبیعت کو اس باب میں قابو میں کیوں نہ رکھا -

عندلیب شادانی نے جو اعتراضات میر پر کبھی کئے تھے - اثر نے ان کا بھی جواب دیا ہے - اور سچ تو یہ ہے کہ خوب دیا ہے - میر کی امرد پرستی پر عندلیب نے جو زور دیا تھا - اور اس طرح ان کی شاعری کو قطعاً غیر اخلاقی تھا یا تھا - اثر نے اس کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے - مگر اس باب میں بھی وہ ذرا آگے بڑھ گئے اور اپنے جوشِ طبیعت کو روک نہیں سکے - صحیح تاریخی اور سوانحی حالات اور تفاصیل میر نہ ہونے کی شکل میں اس پہلو سے نظر بچانا ہی اچھا تھا - مگر عندلیب باز نہ آئے تو اثر ہی کیوں باز رہیں - انھوں نے میر کے یہاں اس پہلو کو محض تقلیدی کہا ہے - یہ رائے یقیناً اعتقادی غلو پر مبنی ہے - میر کا دیوان دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں اس غیر سماجی مشغلہ پر کافی مواد ہے - جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ علت ان میں رہی ہو - یہ مانا کہ میر کے اُن اشعار میں جو اس پہلو پر ہیں جذب کی تڑپ نہیں ہے مگر اس شعر کو کیا کہئے گا :-

کھلا جو نشے میں پگڑی کا پیچ اُس کے میر
سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا،

ہاں یہ میں مانے لیتا ہوں کہ اس سب کچھ کے باوجود اس امر کی کوئی خارجی شہادت ہمارے پاس نہیں ہے کہ میر کبھی فعل شنیع کے بھی مرتکب ہوئے تھے اور اس لئے خواہ مخواہ میر کے کلام کے غیر سماجی عنصر کو اُچھالنا اور گندگی کے ڈھیر لگانا کوئی بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہے - عندلیب جیسے نقاد کی اہلیت اگر اس کی بجائے کسی اور طرف صرف ہوئی ہوتی یقیناً وہ زیادہ کارآمد ہوتی ——— میر کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جس سے زبان و خیال کا ابلاغ ہوتا ہے اور اس طرح زبان و خیال اور اسلوب بیان کے ارتقاء میں مدد ملتی ہے - جن میں زندگی کے غم سامنے آتے اور گوارا ہوتے ہیں - جس سے انسان کے کلیجے میں یورشِ غم سے مقابلہ کرنے کی تاب و تواں پیدا ہوتی ہے - یوں بھی میر نے زبان کی بڑی خدمت کی ہے اور اندازِ بیان کا ایک ایسا تیکھا پن ان کے یہاں ملتا ہے کہ جس نے

اُردو ادب کے بقاو ارتقاء کی طرف پہلی بشارت دی تھی۔ اس کے یہ اشعار دیکھئے :۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

باتیں ہماری یاد رہیں۔ پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا کرتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

ان اشعار میں زندگی سے محبت اور انسانی شرف کا احساس ہے۔ اور ایک ایسے تنزل و انحطاط کے زمانہ میں جب ان باتوں کا احساس مٹ رہا ہو اور انھیں کے ہمعصر درد جب مسند تصوف سے فنا اور صبر و رضا کی تعلیم دے رہے ہوں میر کا یہ لہجہ اور انسانی اقدار میں یہ اٹل یقین ایسے قابلِ قدر عناصر ہیں کہ جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں اثر نے انتخاب میر مولفہ مولوی عبدالحق صاحب پر بھی تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ انتخاب سرسری ہے۔ اور کچھ عمدہ اشعار کو دوہرایا ہے جو اس انتخاب میں جگہ پانے سے رہ گئے ہیں۔ یہ ان کے عمدہ مضامین میں سے ایک ہے۔ ذیل کے اشعار دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ اثر کی رائے کہاں تک درست ہے :۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

نامرادی کی رسم میر سے ہے طور یہ اس جوان سے نکلا

جلوۂ ماہ تہ ابر تلک بھول گیا اُن نے سوتے میں ڈوپٹہ سے جو منھ کو جھانکا

پھر شب وہ لطف تھا۔ نہ وہ مجلس میں نور تھا اس روئے دلفروز ہی کا سب ظہور تھا

ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں، کارخانہ ہے واں تو جادو کا

یہ اشعار واقعی ایسے اشعار ہیں کہ جن کا انتخاب میر میں چھوٹ جانا تعجب انگیز ہے۔ ان میں اندازِ بیان کی گھلاوٹ۔ خیالات و تجربات کی ارتعاش انگیز ترتیب۔ اور حسن کارانہ صناعی سبھی کچھ ہے۔ آج جن اوصاف کے لئے میر کا نام لیا جاتا ہے وہ سب ان اشعار میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کم فرصتی کے باعث یہ اشعار نگاہ سے رہ گئے ہوں۔ ورنہ مولانا عبدالحق صاحب کا ذوقِ سخن اتنا خام تو نہیں۔

اسی طرح اثر نے ایک اور عمدہ کوشش غالب کے بعض اشعار کے مطالب سمجھانے کی کی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غالب کے اشعار کے وہی مطالب اخذ کئے ہیں جو نشست الفاظ اور تراکیب مضامین سے براہ راست منتج ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے دوسرے شارحین کی طرح کلامِ غالب کو ایک بھول بھلیاں بنا کر نہیں رکھدیا ہے۔ غالب کی اس نوع کی شرح کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے کہ غالب کے شارحین نے شرح اشعار کے عوض اپنے دماغی اور نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے غالب کو ایک ذہنی معمہ بنا دیا ہے۔ اور اس طرح مطالعۂ غالب دماغی قلابازی کا ایک ذریعہ ہو کر رہ گیا ہے۔ جناب اثر نے اس طرز کی شرح سے اباء کیا ہے اور اس طرح غالب کو اُس کے اصل مافی الضمیر کے ساتھ سمجھنے کی پہلی باقاعدہ کوشش کی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ جناب اثر اپنا سفرِ حیات ختم کرنے سے پہلے اس نوع کی مکمل شرح دیوانِ غالب لکھ سکیں۔ یہ ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

یہاں تک تو اثر کے تنقیدات کے ایک پہلو سے بحث تھی۔ اب ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اثر کس اصول کے پیرو ہیں اور نقد نگاری میں اُن کا زاویۂ فکر کیا ہے۔ اس لئے کہ بلا اس کے پرکھے ہوئے کوئی قطعی رائے ان کی اہمیت اور اُن کی تحریروں کی قدر و قیمت پر نہیں دی جا سکتی۔ اس غرض سے جب ہم اُن کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں اور کتاب کھولتے ہیں تو جناب اثر کا ذاتی نوٹ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ :۔

"میں تنقید میں کسی خاص اصول یا اسکول کا پابند نہیں ہوں۔ گو اس موضوع پر اکثر کتب قدیم و جدید کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے مستفید ہوا ہوں اور میرے ملکۂ نقد کی اصلاح و تربیت ہوتی ہے۔ جو کچھ پڑھتا ہوں اپنے ذوق وجدان کی رہبری میں اُس کو جانچتا ہوں

اور جو خوبیاں یا خامیاں نظر آتی ہیں معہ وجوہ و دلایل پسندیدگی و ناپسندیدگی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں - اس جایزے میں ہر قسم کے صوری و معنوی محاسن و معائب شامل رہتے ہیں - منشاء اولین اپنی ذہنی آسودگی اور بعد ازاں دوسروں تک تبلیغ ہوتی ہے تاکہ ذوقِ ادب عام ہو اور کھرے کھوٹے کا پردہ کھل جائے"

اس اقتباس کی روشنی میں ہم اثر کے زاویۂ نقد کو سمجھ سکتے ہیں - اور یہ چند سطریں ہمیں ان کے ذہنی عمل و ردِّ عمل کے سمجھنے میں بڑا سہارا دیتی ہیں

یہ تو ظاہر ہے کہ ان سطروں میں باوجود کسی خاص اسکول یا اصول کے پیرو نہ ہونے کے خود بخود چند اصول ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور وہ درج ذیل ہیں :-

(۱) اثر صاحب جو کچھ پڑھتے ہیں اس کو اپنے ذوق و وجدان کی رہبری میں جانچتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے کہ ان کی تنقید تاثراتی انداز کی ہو سکتی ہے تنقید بحیثیت علم و فن ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور اس لئے اُس کے علمی یا فنی ہونے کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی -

رہی یہ بات کہ اثر کا ذوق و وجدان کن چیزوں سے عبارت ہے ؟- اُس کی ترتیب کس اصول پر ہوئی ہے ؟ اور آیا اس وجدان کی جڑیں علم و فن کی زمین میں کتنی گہری اُتر گئی ہیں ؟ اس وجدان میں اُن کے شعور کا کتنا دخل ہے ؟- تہذیب و ثقافت کے کتنے خارجی عوامل نے اس وجدان کو گود کھلایا ہے ؟- ذوقِ ادب کی کیا تعریف ہے ؟ آیا یہ صرف اثر صاحب کی ذات سے مختص ہے یا کوئی ایسی شے ہے جسے کہیں اور بھی ڈھونڈھا جا سکتا ہے ؟ آیا یہ ذوق کوئی مطلق صفت ہے یا کوئی اضافی حیثیت رکھتا ہے ؟- ان سوالات کا کوئی جواب ہمیں اثر صاحب نے نہیں دیا ہے -

(۲) بروقت مطالعہ اثر صاحب جو خوبیاں یا خامیاں کسی ادب پارے میں پاتے ہیں مع وجوہ و دلائل پسندیدگی و ناپسندیدگی ان کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر قسم کے صوری و معنوی محاسن و معائب اس جایزے میں شامل رہتے ہیں -

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تنقید کا کوئی اسکول یا اصول ہی نہیں تو پھر خوبی یا خرابی کے جانچنے کا معیار کیا ہوگا ؟- بلا کسی اصول کو راہنما بنائے بغیر خوبی یا خرابی کا تصور کہاں سے آئے گا ؟ اور اس کے جانچنے کے پیمانے کس طرح وضع ہوں گے ؟ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے دلایل کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے گی ؟- اس لئے کہ جب وجدان ہی راہ بر ہے اور بے اصولی استاد خاص ہے تو پھر خوبی یا خرابی کا حکم لگانے کے لئے وجوہ دلایل کیوں دئے جائیں ؟ - وجوہ و دلایل کی ضرورت تو تبھی پیش آتی ہے کہ جب آپ ایک مقررہ اصول پر کسی شے کو جانچیں - یا ایک مقررہ اصول کے مقابلہ پر دوسرے اصول وضع کریں اور قدیم مقررہ اصول کے مقابلہ پر جدید اصول کی صحت و برتری کے دعویدار ہوں - ظاہر ہے کہ جب یہ صورت نہیں ہے تو یہ سب مراحل کیوں پیش آئیں گے -

(۳) منشاء اولین جناب اثر کا اپنے تنقیدی مضامین سے یہ ہے کہ خود انھیں ذہنی آسودگی حاصل ہو یہ بھی ایک عجیب سی بات ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں تنقید نگاری اس لئے ہرگز نہیں کی جاتی کہ خود لکھنے والے کو ذہنی آسودگی حاصل ہو۔ لیکن ادب برائے ادب کے دعویدار ادب کے اسی رخ پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور جناب اثر بھی اسی پہلو کو منشاء اولین بتلاتے ہیں - چنانچہ انھیں ادب برائے ادب کا نمایندہ سمجھنا چاہئے -

(۴) جناب اثر اپنی ذہنی آسودگی کے بعد اپنے مضامین سے دوسروں تک اپنے خیالات اور تاثرات کی تبلیغ چاہتے ہیں - ادب برائے زندگی والوں کیلئے بھی یہی نکتہ منشاء اولین ہے - جس کو اثر کے یہاں تاخر حاصل ہے - لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ دعوے ریاکارانہ محسوس ہوتا ہے - اس لئے کہ جہاں تک نقاد کی ذہنی آسودگی کا سوال ہے وہ تو مطالعہ ہی سے حاصل ہو جاتی ہے - اس کے لئے تنقیدی مضامین لکھنا ضروری نہیں ہے، جب لکھنے یا کہنے کی بات آئے گی تو اس کا منشاء محض دوسروں تک تبلیغ ہی ہوگا - اور اس لئے جو فن کار یہ کہتا ہے کہ وہ پہلے ذہن کی آسودگی چاہتا ہے اور بعد ازاں تبلیغ خیالات کو وہ دھوکہ دیتا ہے -

(۵) اثر اپنی تنقیدوں کے ذریعہ ذوقِ ادب کو عام اور کھرے کھوٹے کا پردہ فاش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں پھر وہی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جو اوپر نمبر (۱) و (۲) کے سلسلہ میں آچکے ہیں۔ اس لئے کہ اگر مذاقِ ادب کوئی وجدانی چیز ہے تو اس کا عام ہونا مشکل ہے۔ وہ تو محض خاص خاص لوگوں کو ہی ودیعت ہو سکتا ہے اور اگر یہ کوئی باقاعدہ علم وفن ہے تو اس کے اصول وضوابط کا مقرر ہونا بدیہی امر ہے۔ لیکن تنقید کے لئے اثر اصول کو راہ بر بنانے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لئے طے پایا کہ اثر کے نزدیک مذاقِ ادب کسی اصول پر مبنی نہیں ہو سکتا مگر کھرے کھوٹے کی پرکھ کا سوال تو تبھی پیدا ہو سکتا ہے جب کھرا کھوٹا پرکھنے کا کوئی آلہ موجود ہو۔ اور اس کام کے لئے کچھ اصول وضع شدہ ہوں۔ جانچنے کے معیار کی تعیین ہو چکی ہو۔ لیکن جس چیز کا اصول ہی نہ ہو وہاں کھرے کھوٹے کی تمیز کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ وہاں تو جذباتِ محض کی کاریگری رہ جاتی ہے۔ لیکن جہاں جذبات عقل کو بے دخل کر دیں وہاں مزاجی مزاج پھیل جائے گا اور جہاں مزاجی نراج ہوگا وہاں حسن وخوبی کی جگہ معائب لے لیں گے۔ اور تعمیر کی جگہ تخریب آجائے گی۔ یہاں تک کہ نراج کا خودرو پودا بڑھتے بڑھتے تنظیمِ چمن کے درپے ہو جائے گا۔

اس بحث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گو جعفر علی خاں صاحب اثر ادب برائے ادب کے داعی ہیں پھر بھی انھوں نے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحثوں کے ہنگامی دور میں اصول تنقید کے سلسلہ میں مضامین کیوں نہیں لکھے۔ حالانکہ چند سال تو اس قدر بحرانی گزرے تھے کہ ہر چھوٹے بڑے ادیب نے وہ خواہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو اس مسئلہ پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں تو ایسا محسوس ہوا کہ ادب اور ادیبوں کے پاس سوائے اس موضوع کے کوئی دوسرا موضوع رہ ہی نہیں گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی واضح ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ کیوں جناب اثر کے مضامین میں ایسے مضامین کا حیرت انگیز فقدان ہے جو انھوں نے براہِ راست کسی موضوع یا شاعر سے متاثر ہو کر لکھے ہوں۔ ننانوے فیصدی مضامین انھوں نے دوسرے تنقید نگاروں کے جواب یا ان کی تنقیص میں لکھے ہیں۔ جہاں کہیں ان کے معتقدات کو ٹھیس لگی ہے انھوں نے ایک مضمون جواباً لکھ دیا ہے۔ یوں از خود مواد یا موضوع یا ہیئت کی اہمیت سے متاثر ہو کر انھوں نے شاید ہی کوئی مضمون کسی فن پارے یا تصنیف پر لکھا ہو۔ جب نقاد اپنے ذہنی آسودگی کو تقدم اور تبلیغ خیالات کو تاخر دے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا۔ لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ محض نقاد کی اپنی ذہنی آسودگی کے لئے تنقید نگاری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جہاں تک ذاتی ذہنی آسودگی کا تعلق ہے وہ تو اقبال، چکبست، انیس، اصغر، میر، غالب اور مومن کے مطالعہ سے جناب اثر کو ہو جاتی ہے۔ اُس کے لئے تنقید نگاری ضروری نہیں ہے۔ ہاں جب کوئی ناقدان لوگوں کے ان محاسن کو جو اثر صاحب کو ذہنی آسودگی پہونچاتے ہیں تجزیہ کے نشتر سے چھیڑتا ہے اور معائب کی عینک سے دیکھتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کے ذوق جمال کو صدمہ پہونچتا ہے اور فوراً ایک مضمون کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اس طرح وہ چیز جو اُن کے یہاں بقول خود ثانوی درجہ رکھتی ہے اصل میں تنقید نگاری کے وقت منشاء اولین بن جاتی ہے اور اس طرح اُن کے اصولوں کی ترتیب بدلجاتی ہے اور تقدیم و تاخیر کی ترتیب میں الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جو محض دوسرے ناقدین کا جواب لکھنے تک محدود ہے اور اپنے اصول نقد کو بازار میں پیش نہ کرے اور نہ کسی ادب پارے کی بنیادی اور افادی اہمیت کو اُصول کی کسوٹی پر جانچے بلکہ جب دوسرے اپنی رائے دے چکیں تو ان سے جزوی اختلاف کی شکل میں اس کی رائے لوگوں کے سامنے آئے، ذہنوں پر کبھی اپنی بلند قامتی کا تاثر پیدا نہیں کر سکتا۔ یہی وہ سب سے بڑی کمی ہے جو جناب اثر میں پائی جاتی ہے۔ اور اسی لئے ان کا شمار ملک کے صفِ اول کے ناقدین میں نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ صفِ دوم میں جگہ پاتے ہیں۔

دوسری سب سے بڑی کمی جو اثر میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اصول نقد موضوع کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسا ہونا لابدی بھی ہے۔ کیونکہ وہ کسی اصول کے پیرو نہیں ہیں۔ جب آدمی اپنی پسند اور اپنے مذاق کو اپنا امام بنالے اور کسی اصول کے ہاتھ میں اُس کی پسندیدگی کی باگ نہ ہو تو پھر اس رخشِ مذاق کا تھامنا مشکل ہو جاتا ہے۔ غالب کے شعر میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد نقشہ یوں سمجھئے کہ :-

ردیں ہے رخشِ ذوق کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

جناب اثر کا بالکل یہی حال ہے، وہ قدم قدم پر اصول بناتے اور مٹاتے جاتے ہیں اور اس لئے ادب کے باقاعدہ طالب علم کے لئے وہ بجائے کسی رہ نمائی کے گمراہی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ آیئے ان باتوں کو ہم اُن کے تنقیدی مضامین کی روشنی میں جانچیں۔ اور دیکھیں کہ یہ نتائج کہاں تک صحیح طور پر اخذ کئے گئے ہیں۔

چکبست پر ایک مضمون میں جناب اثر فرماتے ہیں کہ :۔ "ہر شاعر (بشرطیکہ وہ حقیقی شاعر ہے) اپنے ماحول سے متاثر ہوتا اور اس کو متاثر کرتا ہے۔ نیز عہدِ ماضی سے اکتساب کرتا اور مستقبل کے لئے نقوش ہدایت چھوڑ جاتا ہے"۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔ "شاید یہ ادّعا غلط نہ ہو کہ اُردو نے اب تک جتنے مقتدر شاعر پیدا کئے اُن کے کلام میں یا تو پیام کا سرے سے پتہ ہی نہ تھا یا پیام کا دائرہ ہی محدود اور روئے سخن کسی خاص جماعت کی طرف تھا، مثال کے طور پر غالب۔ آتش۔ انیس۔ حالی و اقبال کو لیجئے۔ یہ کسی کی منقصت نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے"۔۔۔۔ "چکبست کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہے"۔ اس کے بعد اصغر ایک مضمون کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔ "ہر قوم کی شاعری ہر زمانہ میں اُس کی اقتصادی و معاشرتی حالت کا آئینہ ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے دل بجھے ہوئے ہیں، جن کو زمانہ نے پیس ڈالا۔ جن کے آداب و اخلاق۔ جن کی تعلیم۔ جن کا پاس وضع۔ جن کے قدیم روایات بادنما کی طرح جدھر ہوا کا رُخ ہو پھرنے سے روکتے ہیں۔ اُن سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ ناچیں تھرکیں۔ اور آپ کے قہقہوں میں شریک ہوں۔ انھیں ان کے ماتمکدوں میں مصروف آہ و زاری و نالہ و بکا رہنے دیجئے۔ اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک نہیں ہوتے تو آپ کا کیا نقصان ہے؟"

ان اقتباسات کو بغور دیکھا جائے تو ان میں اجتماع ضدین ملتا ہے۔ اگر اچھا شاعر ماحول سے متاثر ہوتا اور اُسے متاثر کرتا ہے تو ہمیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ہم ان لوگوں کو جو ماتمکدوں میں مصروفِ آہ و بکا ہیں اس ماتمی پردے سے باہر آنے کی دعوت دیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارا صریحی نقصان ہے۔ اور یہ سمیت جو آج ماتمکدوں تک محدود ہے کل سماج اور ادب میں بھی پھیل جائے گی۔ اسی لئے ایک عمدہ پیام۔ ایک اچھے مافی الضمیر ایک بدیع اسلوب اور بلیغ خیال کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیا جاتا رہا ہے اور دیا جاتا رہے گا۔ اسی اصول پر رجعت پسندانہ رجحانات کی مخالفت ہر شہری اور ادب دوست کا فرض ہے اور یہی وہ فرض ہے جس کا سمجھنا ہر اچھے تنقید نگار پر ضروری ہے اس لئے کہ چکبست ہی کی نہیں بلکہ ہر اچھے شاعر کی شاعری اس کے کردار اور اس کے وقت کے اقتصادی و معاشرتی رجحانات کی حامل ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ہر اچھا شاعر وقت کے جملہ رجحانات کی چھان پھٹک کر کے محض ان رجحانات کی نمایندگی کرتا ہے جو زندگی کو حسن اور اجتماعیت بخش سکیں۔ جو نسلِ انسانی کو جلال و جمال کی آمیزش سے زیادہ دلکش اور گوارا بنا سکیں۔ جو وقت کی جملہ خرابیوں کو عیاں کریں۔ اور مستقبل کی رہنمائی کے لئے صحیح سمت کا اشارہ کریں۔ یہی وہ امتیازی خط ہے جہاں تک اثر نئی پود کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں پہونچ کر وہ پھر واپس پلٹ جاتے ہیں اور اس طرح خود اپنے تنقیدی اصولوں کی نفی کرتے ہیں مگر یہی وہ نقطۂ اشتراک ہے جس کی وجہ سے وہ آج بھی مقبول ہیں اور ان کے مضامین میں نئی پود کو کچھ نہ کچھ سامان دلچسپی ضرور ملتا ہے۔

جناب اثر کے مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دفعہ انھوں نے بیحد نازک مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور چند ایسے لوگوں پر اور چند ایسے غیر اہم مضامین کے جوابات بھی لکھے ہیں کہ جن کا نام زمانہ مٹا چکا ہے۔ لیکن مندرجۂ بالا بحث کی روشنی میں اثر کے ان مضامین کی وجہ ذہن میں صاف طور پر اخلاقی ہے۔ اس لئے کہ ذاتی پسند و ناپسندیدگی جب بھی کسی دوسرے کی ذاتی پسند و ناپسندیدگی سے ٹکرائے گی تو بحث کا دروازہ خواہ مخواہ کھل جائے گا، ان مضامین ایک مضمون تو وہ ہے جو تسہیل البلاغۃ میں لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب کسی طرح قابل توجہ نہ تھی مگر افسوس ہے کہ "چھان بین" کا ایک معتد حصہ اس کتاب پر ضایع ہوا ہے۔ دوسرا مضمون مرزا احسان احمد کے جواب میں ہے جنھوں نے "روحِ نشاط" (مجموعہ اصغر گونڈوی) پر کوئی تقریظی انتقاد کیا تھا۔ اگر انھیں مضامین کو کسی باقاعدہ مطالعہ کے نقطۂ نظر سے لکھا جاتا۔ تو یہ ایک ادبی خدمت

ہوتی۔ اور ان مضامین کی مستقل افادی اہمیت بڑھ جاتی۔

تنقید نگاری کی بنیاد کسی نہ کسی علمی وفنی اصول پر رکھنی ہی ہوگی۔ تاثراتی طرز تنقید Impressionistic Criticism میں یہی سب سے بڑا عیب ہے کہ ناقد اپنی رائے کا ایسا تجزیہ وتحلیل کبھی گوارا کر ہی نہیں سکتا جس سے اس کی تنقیص کا کوئی پہلو پیدا ہو، لیکن یہ رجحان علمی وفنی کاموں کے لئے سازگار نہیں ہوسکتا۔ مذاقِ ادب کو اگر عام کرنا ہے تو وجدان کے ساتھ ساتھ اُسے علمی وفنی بنیادوں پر بھی استوار کرنا ہی پڑے گا۔ وجدان کسی علمی کارنامہ کو اعلیٰ ادبی اقدار بخشنے کی حد تک تو کام میں آسکے گا لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ وجدان کی باگ بالکل چھوڑ دیجائے اور اس طرح ایک قسم کی ادبی فسطائیت کے لئے دروازے کھول دئے جائیں۔

روحِ نشاط پر مضمون میں جناب اثر نے فرمایا ہے کہ "ہمیں یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے (شاعر نے) یہ جذبہ یا وہ جذبہ کیوں نظم کیا۔ بلکہ جو کچھ نظم کیا ہے وہ شاعری کی ٹکسال میں کھرا سکہ ہے یا کھوٹا" یہ نہایت خطرناک انداز نظر ہے اسلوب کو موضوع پر ترجیح دینے والے یہی کہتے ہیں۔ لیکن جس طرح موضوع ومواد کو اسٹائل پر ترجیح دینے سے ادب کی ترقی نہ ہوگی، بلکہ زوال ہوگا اور وہ ادب تو شاید نہ رہے گا چاہے اور کچھ کیوں نہ بن جائے۔ اسی طرح اسلوب کو مواد پر ترجیح دینے سے غیر سماجی محرکات وموضوعات کو فروغ حاصل ہوگا جو انسان کی ترقی کے منافی ہوگا۔ اور سماج کو پستی کے گڑھوں میں ڈھکیل دے گا۔ ہمیں دونوں ہی کے سنجیدہ توازن پر زور دینا ہے ہیئت پرستی پر زور دینے سے جنسی گندگیوں کا جو سیلاب میراجی کے ساتھ آیا تھا وہ کچھ زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ اس تجربے سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ ادب اور انسان دونوں ہی اپنی غلطیوں سے سبق لے کر اپنی ترقی کی راہوں کا تعین کرتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر انسان کو شعور کی جو دولت عطا ہوئی ہے وہ بیکار محض ہوکر رہ جائے گی۔ اثر اس کے بعد ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ شاعری کی جس ٹکسال کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ کہاں ہے؟۔ نیز یہ کہ کھوٹا کھرا سکہ جانچنے کے لئے اس ٹکسال میں کون کون سے آلے نصب ہیں۔ اور ان سے کام لینے کا کیا طریقہ متعین کیا گیا ہے؟

اثر اپنے مضمون "شاعر کی راتیں" میں فرماتے ہیں کہ "فطرت کی طرح وہ (جوش) بھی اپنے آرٹ کے مرتب کردہ قوانین کے سوا کسی انسان کے ساختہ قانون یا رسم ورواج کے پابند نہیں ہیں"۔ پھر فرماتے ہیں کہ:۔ "یہ حضرات (ناقدین) بھول جاتے ہیں کہ جوش واعظ نہیں شاعر ہیں۔ یعنی وہ اپنی دلی کیفیات وجذبات کو نظم کرتے ہیں، اس سے قطعاً غرض نہیں ہوتی کہ لوگ سبق لیں گے یا اور زیادہ گمراہ ہوجائینگے" ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ "یہ نظمیں (شاعر کی راتیں نامی مجموعہ کی نظمیں) آرٹ کے مکمل نمونے ہیں۔ اور آرٹ اخلاق سے ہمیشہ بے نیاز رہا ہے اور رہے گا"۔ ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:۔ "شاعر (جوش) اخلاقی نظام سے بغاوت کے باوصف اصول فطرت کی خلاف ورزی کو گناہ عظیم سمجھتا ہے ..... وہ شاعر ہے۔ یعنی عاشق ہے بوالہوس ..... وہ حسن کے ہر منظر کا عورت ہو کہ شاخ گل، پرستار ہے، مگر صرف دور سے تاکہ نشاط دل ودماغ کا سامان مہیا ہو۔ حظِ نفس میں اُن کو شریک کار بنانا۔ (جہاں تک شاعری اور آرٹ کا تعلق ہے؟) اس کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین اور بہیمانہ جرم ہے" (شاید جناب اثر کو جوش کے کوائفِ زندگی سے واقفیت نہیں ورنہ وہ ہرگز ایسا نہ کہتے)۔ یہ نظریہ ہے جو جناب اثر پر پوری طرح حاوی ہے، اور یہ نظریہ سخت گمراہ کن ہے۔ چنانچہ "نظیر اکبر آبادی پر ایک سرسری نظر" میں بھی انھوں نے نظیر کا مطالعہ اس نظر سے کیا ہے۔ اور اس کو موپاساں۔ ایمل زولا۔ اور اس ذیل کے دیگر حقیقت نگاروں سے مماثل بتایا ہے، فرماتے ہیں:۔ "کچھ لوگ ایسے ہیں جو آرٹ سے درس اخلاق کی توقع رکھتے ہیں اور آرٹ کی شوخیوں پر چشم نمائی کرتے ہیں۔ اُن کو چاہئے کہ آرٹ کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور دخل در معقولات نہ دیں۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد یا تو نظیر کی حیثیت بالغ نظر لوگوں کی نگاہ میں گھٹ جائے گی یا خود جناب اثر کی کج فہمی پر سر پیٹے گی۔ نظیر کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ اس نے من وعن گندگیوں کی تصویر کشی کی ہے، بلکہ اس کی بزرگی اس میں ہے کہ فن شاعری کا رخ خواص کے محلوں سے عوام کے گھروندوں کی طرف موڑنے والا وہی تھا۔ موضوعات کے اعتبار سے اُردو شاعری کو عوامی موضوعات بخشنے والوں میں پہلا آدمی نظیر ہی ہے اور زبان کو ٹھیٹ فارسیت کے شکنجے سے نکال کر عوامی بول چال میں ادبیت کا پیام سنانے والا سب سے پہلا شاعر نظیر ہی ہے۔ منظر نگاری میں انیس۔ نظیر اور جوش ہی کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں

جنھوں نے اس طرف باقاعدہ توجہ کی۔ انیس اور جوش جہاں زبان کے انتہ کو اُس کی انتہا پر لے گئے وہاں نظیر نے اس کے مدھم سُر کی دریافت کی ہے ہاں جوش نے الفاظ کی اصوات کو منظر نگاری میں اتنا اہم مقام دیدیا ہے کہ اس تک کوئی نہ پہونچا تھا۔ اس طرز میں اُردو شاعری کا سب سے عظیم فن کار بلاشبہ صرف جوش ہی ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنی تصنیف "ترقی پسند ادب" میں سچ کہا ہے کہ الفاظ کا اتنا بڑا بازیگر دوسرا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ لیکن جوش اور نظیر کو یہ کہکر پیش کرنا کہ وہ آرٹ کے نمایندے ہیں اور اس لئے اخلاق سے معرا ہیں جوش اور نظیر کی سب سے بڑی توہین ہے۔ جوش کی رومانی نظموں میں تو جوانی کا ایک ایسا اُبال ہے بھی کہ وہ اخلاق کی حدوں کو توڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن نظیر کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ نظیر گاندھی جی سے بھی قبل اہنسا کے نظام کا پہلا داعی ہے۔ وہ ایک ایسے پنچایتی نظام اخلاق کا مبلغ ہے، جس کا پہلا منطق شناس کبیر تھا۔ لیکن کبیر کے برخلاف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ :-

"سب غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ ہم میں کچھ نہیں
کچھ نہیں ہم میں تو ہستی و عدم میں کچھ نہیں"

نظیر کا لہجہ کبیر کی لے کا دوسرا نام ہے۔ اس میں جو گھلی ہوئی انسانیت، نرمی، گداز اور اپنایت کی فضاء ہے وہ بجائے خود ایک اخلاقی نظام کی بو باس لئے ہوئے ہے، عوامی شعور کی خوابیدہ طاقتوں کی پہلی انگڑائی کا نام نظیر ہے۔ ظاہر ہے کہ عوامی سماج کسی نہ کسی اخلاقی نظام کے سہارے کے بغیر ٹک ہی نہیں سکتا۔

مضامین زیر بحث کے مطالعہ سے یہ تضاد سامنے آجاتا ہے کہ جہاں اثر نے جوش اور نظیر کو آرٹ کا بلند ترین نمایندہ کہا ہے اسلئے کہ وہ بقول اثر نظام اخلاق سے باغی اور اخلاقی صفات سے معرا ہوجاتے ہیں وہیں انھوں نے اقبال اور چکبست کی اس لئے بھی تعریف کی ہے کہ اُن کے یہاں پیام ملتا ہے۔ شاید اثر یہ بھول گئے کہ چکبست نہ سہی مگر اقبال تو ایک نہایت سخت قسم کے نظام اخلاق کے مبلغ ہیں۔ اُن کی شاعری میں اگر نظام اخلاق اور پیام نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اقبال پر مضمون میں انھوں نے اقبال کے پیام پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے افادی پہلو کو جانچا ہے۔ خودی کی دریافت اور اس کے ارتقا پر محاکمہ کیا ہے۔ معترضین کے جوابات دئے ہیں، اقبال کی اصطلاحات کا مفہوم واضح کیا ہے اور اس طرح وہ ایک ہی سانس میں دو متضاد اصولوں کو اپناتے ہیں، اور اپنے موضوع کے بدلنے کے ساتھ ساتھ پچھلے مضامین میں اختیار کردہ اصول کی تنقیص بھی خود ہی فرماتے جاتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوصف اُردو داں طبقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُن کی بدولت عہدِ آتش و ناسخ سے قبل کے ایک لکھنوی شاعر جناب اختر کے دیوان کا انتخاب سامنے آیا۔ چند عمدہ اشعار سنائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ سنئے اور لطف لیجئے :-

منزلِ پرخطرِ عشق کا کیا حال کہوں، سایۂ چشم بھی واں اپنے لئے رہزن تھا

دو چار ہوتے ہیں جس وقت اس نگاہ سے ہم تو جاتے رہتے ہیں بس اپنے اختیار سے ہم

ہم صفیرانِ چمن لطفِ فغاں کیا جب تک نالہ ہر لحظہ بہ رنگِ دگر ایجاد نہ ہو

خدا ہی جانے کافر کس طرح تو نے ادھر دیکھا کہ یاں اک تیر سا ہر دم جگر کے پار ہوتا ہے

آبروئے گوہرِ کون و مکاں انسان ہے خاک میں یہ نور یہ جلوہ خدا کی شان ہے

قدر اپنی اس جہاں میں انسان اگر نہ سمجھے انسان اُس کو ہرگز اہلِ نظر نہ سمجھے

دل کے دو ٹکڑے کئے منقار بلبل کی طرح عشق نے بخشا ہے تب شوقِ غزلخوانی مجھے

جہاد اس کو نہیں کہتے کہ ہوئے خون انسان کا کرے جو قتل اپنے نفس کافر کو وہ غازی ہے

شب جو پہلو میں نگار آتشیں رخسارہ تھا داغِ دل وقفِ گدازِ گرمیِ نظارہ تھا

قناعت و آزادہ روی ملاحظہ ہو:۔

آستانِ حق جب اپنے واسطے موجود ہے　　کیوں درِ نواب و خاں پر جبہ سائی کیجئے

لیکن دوسری طرف انگریزوں کے دورِ غلامی کی تعریف بھی ملاحظہ ہو:۔

مے کشو مژدہ کہ اس دور میں انگریزوں کے
نہ کوئی محتسبِ شہر ہے نے یاں واعظ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کا یہ تصور جو بیسویں صدی کی دین ہے تب سراسر مفقود تھا۔

آخر میں اثر کے ان مضامین کا ذکر بھی کرتا چلوں جو انھوں نے انیس کی مرثیہ گوئی نامی کتاب میں یکجا کر دئے ہیں۔ یہ جواب ہے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے چند مضامین کا۔ ان میں میر انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کا جایزہ ہے، مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اعتراضات میں تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ اور وہ اپنے تعصبات ذہنی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ انیس محض ایک مخصوص طبقے کے لئے سامانِ دلچسپی رکھتے ہیں اور اس طرح وہ معاشرہ کے لئے بہ حیثیت مجموعی کار آمد نہیں ہیں، تنقید کے پردے میں اپنے تعصبات ذہنی کو چھپانے کا دوسرا نام ہے۔ جس نقاد کو انیس میں محض شیعوں کے لئے سامان گریہ و زاری کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا ہو اُس کے صاحب نظر نہ ہونے کا یقین ہر صاحبِ ذوق کو ہو جائے گا۔ انیس کے مرثیے بالکل اُسی طرح ایک عظیم ادبی کارنامہ ہیں جس طرح تلسی داس کی رامائن یا فردوسی کا شاہنامہ۔ رہی یہ بات کہ لکھنؤ کے شیعہ طبقے کا اخلاق اہلبیت سے منسوب کر دیا گیا ہے تو یہ اعتراض کسی حد تک بجا ہو سکتا ہے۔ مگر یکسر نہیں۔ رامائن میں بھی تلسی داس نے جو آدرش نظام اخلاق پیش کیا ہے اس میں اُن کے عہد کی چھاپ ضرور رہی ہوگی۔ انیس بھی اپنے عہد سے مبرا نہیں ہیں دیکھنا یہ ہے کہ کہاں تک وہ آدرش۔ انسانی تکملۂ اخلاق کا آدرش بن سکتا ہے اور کن حدود تک وہ اسلامی قوانین کے تحت ہوتے ہوئے عظیم انسانی برادری کی ترقی کا نقیب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ انیس نے اس آدرش اخلاقی نظام کو کس حسن کارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ انیس کا جواب اس ذیل میں اُردو شاعری نہ پیش کر سکی ہے نہ کر سکے گی۔ انیس کے کمال شاعری سے انکار اُردو زبان کے عظیم اور بیش قیمت ورثے سے انکار ہے۔ اہلِ ذوق کو جناب اثر کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے بروقت اور برمحل جواب دیا۔ ورنہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے اعتراضات کافی گمراہ کن ثابت ہو سکتے تھے جبکہ بالخصوص ان کو نیاز فتحپوری جیسے ادیب شہیر اور نقاد کی پشت پناہی حاصل ہو۔

لیکن اس کتاب سے سیری نہیں ہوتی۔ بلکہ تشنگی بڑھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جناب اثر، انیس و دبیر کے صناعانہ پہلو پر کوئی مستقل تصنیف یادگار چھوڑتے اس کے لئے اُردو کے ناقدین میں جناب اثر ان معدودے چند تنقید نگاروں میں سے ہیں جو ہمارے شعری ادب سے لطف لینے کا ایک منجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ مانا کہ وہ اس لطف آگینی کا رشتہ سماجی اور تاریخی عوامل سے جڑا ہوا نہیں سمجھتے، لیکن جہاں تک علم و فن عروض و قواعد اور دوسرے فنی صنائع و بدائع کا تعلق ہے جناب اثر گنتی کے اُن ایک دو ناقدین میں ہیں جن سے اس میدان میں رہنمائی کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے اور اس طرح ادب کے رشتہ کو سماجی تحریکات سے جوڑ کر بھی اس کو ادبی حسن کاری میں جادو جگانے کا کام جاری رکھا جا سکتا ہے۔

معراج العاشقین

(اُردو کی اولین تصنیف)

گوپی چند نارنگ نے اسے عمدگی سے از سرِ نو مرتب کیا ہے۔ اُردو کی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے (مالکرام)

قیمت صرف بارہ آنے۔　　ملنے کا پتہ:۔　　آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی

بلتازار

اس زمانہ کا ذکر ہے جب بلتازار، ایتوپیا کا فرمانروا تھا۔ یہ تھا تو سیاہ فام لیکن نقشہ اچھا تھا اور اسی کے ساتھ دانشمند و کریم بھی تھا، اپنی حکومت کے تیسرے برس جب اس کی عمر ۲۳ سال کی تھی، وہ ملکۂ سبا (بلقیس) سے ملنے کے لئے روانہ ہوا، ایک مجوسی (ہمبوبیتیں) اور ایک خواجہ سرا (منقرع) اس کے ہمرکاب تھے اور پچھتر اونٹ مُر، سونا اور ہاتھی دانت سے لدے ہوئے ساتھ ساتھ۔

راستہ میں مجوسی، سیاروں کی تاثیرات اور پتھروں کے خواص اس کو بتاتا جاتا تھا اور خواجہ سرا مذہبی گانے سناتا جاتا ـــــ لیکن وہ ان میں سے کسی کی طرف متوجہ نہ تھا اور اُن لومڑیوں کے تماشہ میں مصروف تھا جو کان اُٹھائے ہوئے ریت پر بیٹھی اُسے نظر آتی تھیں۔

بارہ دن کے سفر کے بعد نسیم بلتازار کے شامہ تک گلاب کی خوشبو پہونچانے لگی اور شہر سبا نظر آیا، یہاں انھوں نے نوجوان لڑکیوں کو پھولوں سے لدے ہوئے انار کے درختوں کے نیچے رقص کرتے ہوئے دیکھا تو مجوسی حکیم بولا کہ:-

"رقص بھی عبادت کی ایک قسم ہے"۔

خواجہ سرا بولا کہ:-

"یقیناً یہ لڑکیاں نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہوں گی"۔

جب شہر میں داخل ہوئے اور بڑی بڑی دوکانیں، وسیع بازار، اسباب تجارت سے بھرے ہوئے دیکھے تو ان کو سخت حیرت ہوئی، وہ انھیں آباد و ہنگامہ زا سڑکوں سے گزر رہے تھے کہ دفعتاً انھیں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ایک نہایت بلند دیوار نظر آئی جس پر متعدد طلائی قبے تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہی قصر بلقیس ہے۔

ملکہ بلقیس اس وقت ایک وسیع شہ نشین میں تھی جو سرد و معطر تھا اور جس کے وسط میں فواروں کا پانی موتیوں کی صورت میں پھیل پھیل کر گر رہا تھا اور چھم چھم کی آواز پیدا کر رہا تھا، بلقیس جواہر کا ملبوس میں وہیں کھڑی تھی، جب بلتازار نے اسے دیکھا تو بے چین ہو گیا کیونکہ اسنے اس کو خواب سے زیادہ شیریں اور خواہش سے زیادہ حسین پایا۔

مجوسی نے آہستہ سے کان میں کہا:-

"اے میرے آقا، اُس سے ایک تجارتی معاہدہ ضرور کر لینا، بھولنا نہیں"۔

خواجہ سرا بولا کہ:-

"جہاں پناہ، ذرا ہوشیار رہئے گا، میں نے سنا ہے کہ وہ سحر سے کام لے کر مردوں کو اپنی محبت میں مبتلا کر دیتی ہے"۔

یہ کہکر دونوں نے بلتازار کو سجدہ کیا اور لوٹ گئے۔

جب بلتازار، بلقیس کے ساتھ تنہا رہ گیا تو اس نے گفتگو کی ابتدا کرنی چاہی لیکن وہ قادر نہ ہوا اور اپنے دل میں سوچا کہ کہیں ملکہ اس سکوت سے غضبناک نہ ہو جائے۔

ملکہ مسکرا رہی تھی اور اسی حالت میں اس نے خود ایسی آواز سے جس کو بہترین نغمۂ موسیقی کہہ سکتے ہیں، سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا کہ:-

"آپ کا آنا میرے لئے باعثِ فخر ہے، آیئے اور میرے پاس بیٹھئے"۔

یہ کہکر اس نے اپنی اُنگلیوں سے (گویا کہ وہ سفید نور کی شعاعیں تھیں) ارغوانی گدوں کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر بچھے ہوئے تھے۔

بلتازار بیٹھا، ایک طویل آہ بھری اور پھر دو تکیوں کو ہاتھ میں لے کر زور سے چیخا کہ :-

" اے ملکہ اگر ان دونوں تکیوں میں سے بھی کوئی تیرا کوئی دشمن ہو جائے تو میں اس طرح اس کی گردن مروڑ دوں "

یہ کہتا جا رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تکیوں میں سختی کے ساتھ گھستے جا رہے تھے یہاں تک کہ کپڑا تار تار ہو گیا اور اندر کے ریشے اڑ کر ہوا میں پھیل گئے۔ ایک آدھ ریشہ ملکہ کے رخسار تک بھی پہونچا اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بلقیس بولی :-

" اور کیوں تم میرے دشمنوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو ؟ "

" کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں "

ملکہ بلقیس نے پوچھا :-

" کیا آپ کے شہر میں کنویں کا پانی شیریں ہوتا ہے ؟ "

بلتازار حیرت زدہ ہو کر بولا " ہاں "

پھر وہ بولی کہ :-

" مجھے یہ معلوم کرنے کا بڑا شوق ہے کہ ایتھوپیا میں خشک مربا کیونکر طیار ہوتا ہے "

بلتازار اور زیادہ متحیر ہوا۔ لیکن بلقیس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ :-

" ہاں، ہاں، میری خاطر سے بتاؤ "

بلتازار نے اپنے حافظہ پر زور دیا اور بیان کرنے لگا کہ مربّہ بنانے والے کس طرح بھی کو شہد میں پکاتے ہیں، لیکن بلقیس نے کچھ نہیں سنا اور دفعتاً قطع کلام کر کے بولی :-

" تم تو ملکہ (کنداس) سے محبت کرتے ہو۔ مجھے دھوکا نہ دو۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے ؟ "

بلتازار اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا کہ :-

" اے ملکہ، تجھ سے زیادہ خوبصورت ! کیا یہ ممکن ہے ؟ "

لیکن ملکہ برابر ملکہ کنداس کی آنکھ، منہ، رنگ، گردن کے متعلق سوال کرتی رہی، بلتازار نے اپنے بازو اسکی طرف بڑھائے اور بولا :-

" اے ملکہ، وہ چھوٹا سا ریشہ جو تیرے رخسار پر ہے مجھے لے لینے دے اور اس کے عوض میں مجھ سے میری نصف مملکت معہ مجوسی حکیم اور خواجہ سرا کے لے لے "

لیکن ملکہ بلقیس اُٹھ کھڑی ہوئی اور زور سے قہقہہ لگا کر دور چلی گئی۔

جب مجوسی اور خواجہ سرا آئے تو انھوں نے بلتازار کو اس قدر پریشان پایا کہ اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا اور وہ سمجھا کہ شاید معاہدۂ تجارت کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

شام کو جب بلتازار نے ملکہ بلقیس کے ساتھ کھانا کھایا اور شراب پی، تو بلقیس نے پھر اُس سے پوچھا :-

" کیا یہ صحیح ہے کہ ملکہ کنداس مجھ سے زیادہ حسین نہیں ہے ؟ "

بلتازار بولا :-

" ملکہ کنداس تو سیاہ فام ہے "

بلقیس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی :-

" کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سیاہ رنگ کا ہو اور قبیح نہ ہو "

"بلقیس!....."

بلتازار اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس کو اپنی آغوش میں لے کر پیشانی کا بوسہ دینا چاہا، لیکن اسے دیکھ کر کس قدر حیرت ہوئی، ملکہ رو رہی ہے۔

بلتازار نے پوچھا:۔

"اے ملکہ تو کیوں رو رہی ہے۔ مجھ سے بتا کہ تو کیا چاہتی ہے؟"

بلقیس نے رونا بند کیا تو دیر تک ساکت و متحیر رہی اور پھر بولی کہ:۔

"عرصۂ دراز سے ایک نامعلوم خطرہ میں گھری ہوئی ہوں، لیکن وہ اب تک مجھ پر قابو نہیں پا سکا کیونکہ سبا کے دیوتا اور یہاں کی آبادی میری حفاظت کرتی ہے، لیکن جہاں رات آئی خوف کی کپکپی میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میرے سر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

یہ کہکر اس نے بلتازار کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا کہ:۔

"آؤ شہر میں بھیس بدل کر چلیں۔"

یہ کہکر وہ کھڑکی کے پاس آئی اور سامنے کے میدان کو دیکھ کر بلتازار سے بولی کہ:۔

"محل کی دیوار کے نیچے ایک فقیر سو رہا ہے، تم جاؤ اپنے کپڑے اس کے حوالہ کرو اور اس کا موٹا لباس اور اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا عمامہ لے کر تم پہن لو۔ جلدی کرو۔"

یہ کہکر وہ کھانے کے کمرے سے چلی گئی اور بلتازار نے اپنا زرکار لباس اتار کر فقیر کے کپڑے پہن لئے اتنے میں بلقیس بھی آگئی اس حال میں کہ وہ نیلے رنگ کی بغیر سلی ہوئی پاردہ پہنے ہوئی تھی اور بولی کہ:۔ "آؤ"

(۲)

رات تاریک تھی اور بلقیس اس کے اندر روشن تارہ کی طرح چمک رہی تھی۔ بلتازار کو ساتھ لئے ہوئے چلی اور ایک شراب خانہ میں پہونچی جہاں بازاری لوگ اور فاحشہ عورتیں نظر آرہی تھیں یہاں یہ دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے اور دیکھا کہ کہیں کچھ بدمعاش کسی عورت یا شراب کے لئے آپس میں لڑ رہے ہیں اور کہیں بعض لوگ خمار میں فرش پر پڑے ہوئے ہیں، یہاں کی ہوا بہت کثیف تھی اور سخت بو آرہی تھی۔

بلقیس نے دیکھا کہ مچھلیوں کے ٹکڑے چھت میں لٹکے ہوئے ہیں اور اس نے بلتازار سے کہا:۔

"میں ایک مچھلی کتری ہوئی پیاز کے ساتھ کھانا چاہتی ہوں۔"

بلتازار نے خادم کو لانے کا حکم دیا۔ لیکن جب بلقیس کھا چکی تو بلتازار کو خیال ہوا کہ وہ اپنے ساتھ روپیہ تو لایا ہی نہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ "بغیر دام ادا کئے ہوئے میں یہاں سے نکل جاؤں گا" مگر جب اس نے ایسا ارادہ کیا تو مالک دوکان نے راستہ روک لیا اور دونوں کو گالیاں دینے لگا۔

بلتازار کو غصہ آیا اور گھونسہ مار کر اس کو زمین پر گرا دیا، اب شرابیوں کو ذرا ہوش آیا تو چھریاں لے کر دوڑ پڑے لیکن اتفاق سے بلتازار کو پیاز کوٹنے کی بڑی موگری مل گئی اور اس نے اس کی ضرب سے دو کو وہیں گرا دیا۔ باقی چھپ گئے۔ بلقیس اس اثنا میں برابر بلتازار کے پہلو سے لگی رہی اور اپنے جسم کی حرارت سے بلتازار میں جوش پیدا کرتی رہی۔

اب لوگوں نے دور ہی سے ان پر حملہ شروع کر دیا اور پیالے، ہانڈیاں، شمعیں جو کچھ ہاتھ آیا پھینک پھینک کر مارنے لگے یہاں تک کہ ایک نے شراب کا بڑا بھرا ہوا دیگ بلتازار کے سر پر پھینک کر مارا جس سے اس کو سخت صدمہ پہونچا۔

اب بلتازار نے نجات اسی میں دیکھی کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے، چنانچہ اس نے بلقیس کو اپنی آغوش میں لیا اور تنگ و تاریک راستوں میں ہو کر بھاگ گیا۔ کچھ دیر تک تو تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آواز آتی رہی لیکن بعد کو سناٹا ہو گیا اور کوئی آواز بلقیس کو نہ سنائی دی، سوا اُن قطرات خون کے جو بلتازار کی پیشانی سے اس کی گردن پر گر رہے تھے۔

ملکہ بولی:۔ "میں تجھ سے محبت کرتی ہوں"۔

اب بادلوں سے چاند نکلا اور بلتازار نے بلقیس کی آنکھوں میں ایک مشتعل سپید نور دیکھا جو اس کی لانبی پلکوں کے اندر سے جگمگا رہا تھا۔

بلتازار ایک خشک حوض کی نالی کے اندر سے لڑکھڑاتا ہوا گزر رہا تھا کہ اس کا قدم پھسلا اور دونوں ہم آغوش وہیں گھاس پر گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔

اتفاق سے اسی وقت ایک جماعت قزاقوں کی اُدھر سے گزری اور ان کو دیکھ کر بولی کہ:۔ "ہر چند یہ دونوں فقیر ہیں لیکن ہیں جوان و حسین اس لئے دام اچھے مل جائیں گے"۔

چنانچہ انھوں نے دونوں کو رسّی سے باندھ کر گدھے کی پیٹھ پر کس دیا اور روانہ ہو گئے۔ جب بلتازار کو ہوش آیا اور اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا تو لگا قزاقوں کو ڈرانے دھمکانے مگر انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔

دونوں اسی حال میں جا رہے تھے کہ صبح ہوئی اور آفتاب جوں جوں بلند ہونے لگا، گرمی بڑھتی گئی، آخر کار دوپہر کو قزاقوں نے اپنا ڈیرہ لیا، ان کو بھی ایک چٹان کے سایہ میں بٹھا دیا۔ اور سڑی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ان کے سامنے ڈال دیا۔ بلقیس نے اس کو اُٹھا لیا اور ہنسنے لگی۔ قزاقوں کے سردار نے ہنسی کا سبب دریافت کیا تو بولی کہ:۔

"میں اس لئے ہنس رہی ہوں کہ بہت جلد تم سب کو پھانسی پر چڑھائے جانے کا حکم دینے والی ہوں"۔

سردار بولا:۔ تجھ ایسی عورت کے منھ سے جس کا کام صرف برتن دھونا ہے، ایسی گفتگو بہت عجیب ہے، شاید تو اپنے اس سیاہ فام رفیق پر اعتماد کرتی ہو گی اور یہی تیرے حکم کی تعمیل میں ہم لوگوں کی گردن مارے گا"۔

بلتازار کو بلقیس کی ایسی توہین گوارا نہ ہوئی اور اس نے جھپٹ کر قزاق کی گردن پکڑ کر گلا گھوٹنا شروع کیا، لیکن قزاق نے بلتازار کے پیٹ میں ایسی چھری چبھوئی کہ فریب بلتازار وہیں ایک نظر یاس بلقیس پر ڈالتا ہوا گر پڑا۔

(۳)

اسی وقت سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور بلقیس فوراً پہچان گئی کہ اس کا سردار (انیر) مجھے ڈھونڈھنے سے آیا ہے۔

سردار نے بلقیس کے قدموں کے پاس تین بار سجدہ کیا اور پھر ہودہ طیار کرنے کا حکم دیا، سپاہی اس دوران میں قزاقوں کو پکڑ رہے تھے، ملکہ نے قزاقوں کے سردار کو دیکھا اور بولی کہ:۔ "اب شاید تم یہ نہ کہو گے کہ میرا تمھارے پھانسی دئے جانے کے متعلق کہنا ہذیان تھا"۔

جب مجوسی حکیم اور خواجہ سرا نے اپنے مالک کو زمین پر پڑا ہوا دیکھا تو گھبرا کر دوڑ پڑے، چونکہ مجوسی فنِ طب میں حاذق تھا اس لئے فوراً بادشاہ کو دیکھا اور معلوم کر کے کہ ابھی اس میں کچھ حیات باقی ہے مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ جب اس سے فارغ ہوا تو ایک گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر اس کو بھی لے چلے اور قصر بلقیس تک پہونچ گئے۔

بلتازار پندرہ دن تک ہذیان کے عالم میں رہا۔ سولھویں دن آنکھ کھولی تو اپنے پاس مجوسی اور خواجہ سرا کو دیکھا۔ ملکہ کو وہاں موجود نہ پا کر اس نے گھبرا کر پوچھا کہ "وہ کہاں ہے؟"

خواجہ سرا بولا کہ:۔ "شاہ کو انیر کے ساتھ تخلیہ میں ہے"۔

مجوسی نے کہا:۔ "یقیناً وہ دونوں اسباب تجارت کے تبادلہ کا معاہدہ کر رہے ہوں گے"۔

بلتازار بولا کہ:۔ "میں اسی وقت ملکہ سے ملنا چاہتا ہوں"۔

یہ کہا اور خود چل کھڑا ہوا اور جب ملکہ کی خوابگاہ کے قریب پہونچا تو وہاں سے شاہ کو ماجین کو نکلتے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور سونے کے ذرات اس کے لباس پر چمک رہے تھے۔

بلقیس سرخ ریشم کے فرش پر دراز تھی اور مسکرا رہی تھی۔

بلتازار بولا:۔

"اے بلقیس، اے میری راحتِ روح!"

لیکن اس نے کوئی التفات نہیں کیا اور اس طرح پڑی رہی جیسے کوئی نفیس خواب دیکھ رہی ہے، بلتازار آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن ملکہ نے نفرت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی:۔

"تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

بلتازار نے روتے ہوئے جواب دیا:۔ "یہ سوال تو مجھ سے کرتی ہے؟"

بلتازار نے محسوس کیا کہ بلقیس کی آنکھوں سے بے رحمی برس رہی ہے اور اس طرح دیکھ رہی ہے گویا گزشتہ واقعات کا اُسے علم ہی نہیں ہے، بلتازار نے اس رات کا واقعہ یاد دلایا لیکن اس نے کچھ نہیں سنا اور بولی:۔

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کا نشہ ابھی باقی ہے یا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے" بلتازار مایوس ہو کر چیخ اٹھا

"خواب!، یہ سب کچھ خواب کیسے ہو سکتا ہے کیا میرے جسم پر چھری کے یہ نشان بھی خواب کی باتیں ہیں"

یہ سن کر بلقیس اپنے ملبوس کے جواہرات کو چمکاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:۔

"انعقادِ مجلس کا وقت آگیا ہے اور اب مجھے فرصت نہیں کہ خواب کی باتوں پر توجہ کروں۔ میں تم کو نصیحت کرتی ہوں کہ جا کر آرام کرو"

یہ سن کر بلتازار نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے قویٰ جواب دے رہے ہیں، لیکن اس نے بہت ضبط سے کام لیا تاکہ اس قسی القلب عورت کے سامنے اس کی کمزوری ظاہر نہ ہو، لیکن جب بلقیس چلی گئی اور وہ اپنے حجرے میں پہونچا تو غش کھا کر گر پڑا اور زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔

(۴)

تین ہفتہ تک بلتازار بے ہوش پڑا رہا۔ بائیسویں دن جا کر مشکل سے اس میں پھر آثارِ حیات پیدا ہوئے اور اس نے آنکھ کھول کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو بولا:۔

"اے حکیم، دنیا میں نیکی کا وجود نہیں ہے"

مجوسی نے جواب دیا:۔

"حکمت انسان کو نیک بنا سکتی ہے"

بلتازار نے کہا:۔ "اچھا میں اسے حاصل کروں گا، لیکن فی الحال تو اٹوپیا واپس چلنا چاہئے"

(۵)

بلتازار گھنٹوں مجوسی حکیم اور خواجہ سرا کے پاس بیٹھا رہتا، اپنے قصر سے افق کے نخلستان کی شاخوں کو دیکھتا رہتا۔ ساحلِ نیل پر پڑے ہوئے گھڑیالوں پر چاند کی روشنی میں غور کیا کرتا۔

ایک رات مجوسی نے کہا:۔

"انسان فطرت کے مطالعہ سے کبھی نہیں تھک سکتا"

بادشاہ بولا:۔

"بیشک۔ لیکن فطرت میں درختوں اور گھڑیالوں سے زیادہ حسین چیزیں بھی شامل ہیں" اس وقت اُسے پھر بلقیس یاد آگئی تھی۔

مجوسی بولا:۔

"اس دریائے نیل کے فیضان اور اس کی وسعت کو دیکھو کسقدر عجیب ہے جس کے اسباب کے ادراک کی مجھ کو توفیق عطا ہوئی ہے، کیا انسان فہم و ادراک کے لئے نہیں پیدا ہوا؟"

بادشاہ نے ایک آہ سرد بھر کر جواب دیا:۔

"انسان تو محبت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں۔"

مجوسی:۔ "مثلاً؟"

بادشاہ:۔ "عورت کی غیر وفاداری"

بادشاہ نے مجوسی مسلک اختیار کر لیا اور ایک بڑے برج کی تعمیر کا حکم دیا تاکہ اس کے اوپر سے چاروں طرف کے ممالک اور فضاءِ آسمانی بالکل صاف نظر آئے، یہ برج دو سال میں طیار ہوا اور بلتازار نے اپنے باپ کی ساری جمع کی ہوئی دولت اس پر صرف کر دی۔

اب مجوسی نے اس کو علم نجوم کی تعلیم شروع کی۔ چنانچہ بادشاہ کو لے کر وہ ہر رات اس برج پر چڑھ جاتا اور بتاتا کہ یہ کواکب قبۂ فلک میں جڑے ہوئے ہیں، ان میں سے بعض مرد ہیں، بعض عورت اور ان سے وہ رموز وابستہ ہیں جن سے ہمیں اپنے مقدرات کے خیر و شر کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

بلتازار کہتا:۔ "یہ سب صحیح ہے، لیکن مجھے تو تم ایسے علوم سے آگاہ کرو جس سے میرا دل بلقیس سے پھر جائے"

چنانچہ مجوسی نے اُسے حکمت کی طرف توجہ دلائی یہاں تک کہ بلقیس کا خیال اس کے دل سے نکل گیا۔

جب خواجہ سرا کو یہ معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا اور اپنے مالک سے ایک دن کہا کہ:۔

"اے میرے مالک تجھے معلوم ہے کہ ملکۂ بلقیس کے پاؤں بکری کی طرح ہیں؟"

بادشاہ نے پوچھا:۔ "یہ مہمل بات تجھ سے کس نے کہی؟"

اس نے جواب دیا کہ:۔ "ملک سبا اور اٹوپیا میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ بلقیس کی پنڈلیوں پر بال ہیں اور اُس کے قدم کھُر کی طرح ہیں۔"

یہ سُن کر بلتازار کو تکلیف ہوئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بلقیس کے پاؤں کس قدر حسین ہیں اور اس کو وہ وقت یاد آ گیا جب وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ جس سے اس نے محبت کی تھی وہ لوگوں کے خیال میں کس قدر مسخ ہے۔ اس کو فی الجملہ ترک محبت پر افسوس نہیں ہوا اور پھر علم و حکمت کے سیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

بلتازار نے علم سحر و نجوم اس قدر جلد حاصل کر لیا کہ وہ نہایت آسانی سے بڑے بڑے احکام نافذ کرنے لگا۔ ایک دن اس نے اپنے استاد سے کہا:۔ "میں تیرے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری ایک اطلاع بالکل صحیح ہے۔"

اس نے جواب دیا:۔

"بے شک علم نجوم غلطی سے پاک ہے، لیکن اس کے جاننے والے ہمیشہ غلطی کیا کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا:۔ "اگر سماوی حقیقتیں ہم سے ہمیشہ مستتر رہنے والی ہیں تو ہمارا ان کی جستجو میں سر کھپانا بیکار ہے، میں نے ایک نیا ستارہ دیکھا ہے جو بہت حسین ہے اور مجھ سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی اس طالع میں پیدا ہوا وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے، آؤ میں تمہیں وہ ستارہ دکھاؤں۔"

لیکن مجوسی نے وہ تارا نہیں دیکھا، یا نہیں دیکھنا چاہا، کیونکہ وہ پرانے لوگوں کی عادت کے مطابق نئی چیز کو پسند نہیں کرتا تھا۔

رات کی تاریکی میں جبکہ بلتازار تنہا تھا اس نے پھر اپنے دل میں کہا:۔ "کیسا خوش نصیب ہے وہ بچہ جو اس ستارہ کے طالع میں پیدا ہو۔"

(۶)

سارے اٹوپیا اور قرب و جوار کے ممالک میں یہ خبر عام ہوگئی کہ بلتازار کو بلقیس سے محبت نہیں رہی، جب یہ خبر ملکہ کو پہونچی تو وہ بہت برہم ہوئی اور اس نے ایسا محسوس کیا گویا بلتازار نے اس کی خیانت کی ہے، وہ دوڑی ہوئی شاہ کو ماجین کے پاس گئی (جو تمام اپنے ملک کے انتظامات کو خاک میں ملاکر یہاں پڑا ہوا تھا) اور اس سے بولی کہ :- "اور بھی کچھ تم نے سنا کہ بلتازار نے میری محبت ترک کردی ہے"۔

اس نے کہا "جب تک ہماری تمھاری محبت قایم ہے اس کی کیا پروا ہوسکتی ہے"۔

بلقیس بولی کہ :- "یہ سب کچھ صحیح سہی، لیکن اس سیاہ فام نے جو میری اہانت کی ہے اس کو کیونکر برداشت کرسکتی ہوں"۔

چنانچہ بلقیس نے اسے اٹوپیا چلنے کا حکم دیا اور کہا کہ :- "میں نے آج شام کو سفر کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اس لئے غروب آفتاب تک تمام سامان درست ہوجانا چاہئے"۔

بلتازار برج پر ایک رات بیٹھا اس نئے ستارہ کا نظارہ کر رہا تھا کہ صحرا میں دور اُسے سیاہ سادہ دھاگا نظر آیا۔ لیکن دیر کے بعد یہ دھاگا زیادہ روشن ہونے لگا اور رفتہ رفتہ کچھ گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی نظر آئے، آخرکار بلتازار کو معلوم ہوگیا کہ یہ ملکۂ سبا کا باڈی گارڈ ہے، اس کے بعد اس نے خود ملکۂ سبا کو بھی دیکھا جس سے اس کے دل میں سخت اضطراب پیدا ہوگیا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا پھر از سر نو اس کی محبت میں مبتلا ہوجائے گا، لیکن اسی وقت جبکہ نیچے ملکۂ بلقیس اپنے مطلا ہودہ میں جواہر کا لباس پہنے ہوئے جگمگا رہی تھی اوپر وہ نیا ستارہ چمک رہا تھا۔

جب بلتازار نے اوپر نگاہ کی تو ستارہ نے اس سے گفتگو کی کہ :-

"سلامتی ہے اُس شخص کے لئے جو اپنے عزم میں استوار رہا۔ اے شاہ بلتازار، ایک صاع مُرّ لے کر میرے ساتھ ہوجا، تاکہ میں تجھے اس بچّہ کے قدموں تک پہونچادوں جو اس ساعت میں درندوں کے درمیان پیدا ہوا ہے، یہ بچّہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تجھے اپنے پاس بلاتا ہے چونکہ تو نے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں اس لئے وہ تجھے امن و سکون دینے کے لئے طلب کر رہا ہے اور تجھ سے کہے گا کہ فقیر ہوجا کیونکہ یہی حق کی دولت ہے، وہ تجھ سے کہیگا کہ سچی فرحت خوشی کے ترک کردینے میں ہے اور تجھے بتائے گا کہ سوائے اس کے اور کوئی محبت کے قابل نہیں ہے"۔

ان کلمات سے بلتازار بہت متاثر ہوا ایسا محسوس کرنے لگا کہ وہ انسانیت کا دور جدید شروع کرنے والا ہے۔

تھوڑی دیر تک بلقیس منتظر رہی لیکن جب اُس نے دیکھ لیا کہ بلتازار کے اس قلب میں جہاں عبادت نے اپنا گھر بنالیا ہے۔ اُس کی محبت نہیں سما سکتی تو سخت برہم ہوئی اور اپنے ساتھیوں کو فوراً واپسی کا حکم دیا۔

پھر بادشاہ مع اپنے رفیقوں کے بُرج سے اُترا اور ایک صاع مُرّ لے کر روانہ ہوگئے۔ یہ دونوں تک سفر کرتے رہے اس حال میں کہ وہی ستارہ ان کے آگے آگے رہبری کرتا جاتا تھا۔ راستہ میں اور بہت سے مجوسی بادشاہ ملے جن کی رہبری بھی یہی ستارہ کر رہا تھا۔ سب کے سب سفر کرتے رہے، حتیٰ کہ وہ ستارہ ٹھہر گیا اور سب نے جان لیا کہ وہ لڑکا اسی جگہ ہے۔

جب یہ ایک گھر میں داخل ہوئے تو انھوں نے مریم کے حجرہ میں ایک بچّہ پایا۔ جس کے سامنے یہ لوگ سربسجود ہوگئے اور اس کے سامنے مُرّ سونا اور لوبان پیش کیا جیسا کہ انجیل میں مذکور ہے۔

(اناطول فرانس کا ایک شاہکار)

مرثیہ نگاری اور میر انیس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بسیط مقالہ جس میں جدید اصول نقد کے پیش نظر میر انیس کے فن مرثیہ نگاری سے بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

(ہر شاعر کا منتخب کلام)

(بچوں کے قریب عنوانات)

گلستانِ ہزار رنگ

مضمون وار منتخب اشعار کی نادر الوجود انسائکلوپیڈیا

مقدمہ

از حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

حضرت مولانا آزاد ۔" مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ سید بہاء الدین احمد صاحب نے ایک عرصہ کی محنت اور جستجو کے بعد ایک ایسا مجموعہ طیار کرنے کی کوشش کی ہے ... انھوں نے اُردو شاعری کے نظر و مطالعہ کی ایک نئی راہ کھولدی ہے ... عنوانوں کے تحت کہنے میں ہر طرح کے مواد و مطالب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اشعار کا انتخاب بھی سلیقے کے ساتھ کیا گیا ہے ....."

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ۔" آپ کی محنت کا پھل سب کے لئے قابلِ قدر ہے ... میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں"

جناب رشید احمد صدیقی ۔" ... میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس نوعیت کی جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں آپ کی کتاب سب سے بہتر ہے ۔ مجموعہ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے ... اور آپ قابلِ تہنیت "

مولانا نیاز فتحپوری "نگار" میں ۔" ... اس میں شک نہیں کہ یہ تالیف فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ و حسنِ ذوق کی بڑی قیمتی دستاویز ہے ۔ دیباچہ کو اُردو ادب کی مختصر تاریخ کہنا غلط نہ ہوگا ۔ یہ کتاب گویا تاریخ تذکرہ اور انتخاب کلام کا بڑا دلچسپ " آمیزہ " ہے جس کی ملک کو قدر کرنا چاہیئے ....."

ماہنامہ "آج کل" دہلی ... ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق اس ادبی تحفے کو ہاتھوں لیں گے اور کوئی لائبریری اس سے خالی نہیں رہے گی ...

ماہنامہ "صبا" حیدرآباد دکن ۔" ... مجموعہ صحیح معنوں میں گلستانِ ہزار رنگ ہے ... کتب خانوں، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں اور بطور خاص طلبا کے لئے ..... ایک قابلِ قدر تحفہ ہے ....."

قیمت مجلد عہ ر محصول ڈاک ذمہ ناشرین (نہایت نفیس کاغذ - بہترین کتابت و طباعت، بہت حسین جلد)

(یہ مجموعہ ہندی رسم الخط میں بھی شایع ہوا ہے جس کی تقریظ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر اعلیٰ بہار نے لکھی ہے)

ملنے کا پتہ :- **گیان منزل پبلیکیشنز - دریاپور - پٹنہ - ۴ (بہار)**

مکتبۂ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں، آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔
ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمائیے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں ان کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعۂ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے (کمیشن وی پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے۔ جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بہ حساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا پڑے گا۔

منیجر نگار لکھنؤ

سلسلۂ تاریخ و سوانح

تاریخ و تذکرہ نگاری نے پچھلے دس سال کے اندر جو نئی راہیں اختیار کی ہیں وہ ان راہوں سے بالکل مختلف ہیں جو اب سے چند سال قبل پائی جاتی تھیں۔ پہلے مورخ ایک خشک قسم کا فلسفی ہوتا تھا جو محض حالات و واقعات کو سامنے رکھتا تھا، لیکن آج کا مورخ ادیب بھی ہے اور شاعر بھی، اور نفسیات داں بھی جو تاریخ کے خشک و بے نمک واقعات کو ایک داستان و تمثیل کے رنگ میں پیش کرتا ہے اور ہم اس میں محو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس جدید راہ کو جس حسن و خوبی سے جدید مصری مورخین نے اختیار کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو ذیل کی کتابوں سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار ان کو شروع کر دینا گویا ان کو ختم کر دینا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف و شگفتہ ہے اور طباعت حد درجہ دیدہ زیب۔

حیات محمد۔ (محمد حسین ہیکل) ۔۔۔ انیس ۱۹ روپیہ
ابوبکر صدیق (" ") ۔۔۔ دس روپیہ
الحسین (عمر ابو النصر) ۔۔۔ ڈھائی روپیہ
الزہرا (" ") ۔۔۔۔۔ دو روپیہ
الہارون (" ") ۔۔۔۔۔ پانچ روپیہ
خالد سیف اللہ (ابوزید شلبی) ۔۔۔ پانچ روپیہ
عمرو بن العاص (حسن ابراہیم حسن) پانچ روپیہ
چنگیز خاں (ہیرلڈ لیمب) ۔۔۔ پانچ روپیہ
امیر تیمور (" ") ۔۔۔ سات روپیہ

سلسلۂ نفسیات عملی

آج کل جینا ایک فن ہے اور اب وہی لوگ صحیح معنی میں زندہ رہ سکتے ہیں جو اس فن کے رموز سے واقف ہیں۔ اس وقت مغرب کی کامیاب زندگی کا راز صرف یہی ہے کہ وہ "نفسیات عملی" کا ماہر ہے اور زندگی کی ہر راہ میں وہ صرف نفسیاتی رموز کو سامنے رکھتا ہے، جن سے اہلِ مشرق ناواقف ہیں۔ ذیل کی کتابوں سے جو مشہور ماہرین نفسیات کے تجربات کا نچوڑ ہیں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم دنیا میں کیونکر عیش و مسرت کی کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان تصانیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں خشک علمی مباحث پیش نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان میں زندگی کے صرف ان تجربات کو ظاہر کیا گیا ہے جو اپنے اندر داستان سے زیادہ دلکشی و دلچسپی رکھتے ہیں۔

جینے کا قرینہ (آندرے موروا) ۔۔۔ چھ روپیہ
پریشان ہونا چھوڑئے (ڈیل کارنیگی) چھ روپیہ
میٹھے بول میں جادو ہے (") سات روپیہ
زندگی اور عمل (ڈاکٹر مارڈن) دو روپیہ آٹھ آنے
کامیاب زندگی (ہربرٹ کیسن) دو روپیہ آٹھ آنے
جینے کی اہمیت (لین۔یو۔تانگ) بارہ روپیہ
زندگی کا راستہ (ویس ٹیس چیپر) ۔۔ چھ روپیہ
کامیابی کا راستہ (") ۔۔ چار روپیہ
اپنا راستہ خود بناؤ (فایق کامران) چار روپیہ
آداب زندگی (محمد اقبال سلمان) تین روپیہ

بعض اور مفید و دلچسپ کتابیں

مقدمہ شعر و شاعری (ڈاکٹر وحید قریشی) چھ روپیہ
شعراء اردو کے تذکرے (ڈاکٹر سید عبداللہ) دو روپیہ
علم کے نئے افق (سی۔ام۔جوڈ) چار روپیہ آٹھ آنے
افکار غالب (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) آٹھ روپیہ آٹھ آنے
فکر اقبال (" ") دس روپیہ
روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) سات روپیہ آٹھ آنے
شعر العجم کامل (مولانا شبلی) ۔۔۔۔ بارہ روپیہ
تاریخ الامت ۶ حصے (مولانا اسلم جیراجپوری) پندرہ روپیہ
ترجمان القرآن (مولانا آزاد) اول و دوم تیس روپیہ
شعر الہند کامل (عبدالسلام ندوی) اٹھارہ روپیہ
اردو غزل (یوسف حسین خاں) ۔۔۔ دس روپیہ

مشرقیات اور علماء مغرب

انسان کی ذہنی ترقی انفرادی حیثیت رکھتی ہو یا اجتماعی دو قسم کی ہوا کرتی ہے، ذاتی و اضافی۔ اضافی ترقی سے مراد اس کے وہ تمام اعمال ہیں جن کا تعلق صرف اس کی فطرت اور خود اس کے دماغ کی اہلیت اختراع سے ہوتا ہے اور اضافی ترقی سے میرا مدعا ان اکتسابات سے ہے جو عالم و مافی العالم کے مشاہدہ اور دوسروں کے افکار کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اہلِ مغرب ترقی کے جن مدارج کو طے کر چکے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن اگر اس ترقی کی تاریخ مرتب کی جائے تو بہت سی ایسی جزئیات ظاہر ہو سکتی ہیں جن پر لوگوں کو اطلاع ہے۔

مغرب آج کل علوم و فنون کا مرکز ہے، انسانی عروج و ترقی کا مولد و منشا ہے، نہضت علمی کا مخرج و منبع ہے اختراعات و ابداعات کا مسکن ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ وہاں کا ہر انسان ذاتی ترقی کے لئے بہترین ساخت کا دماغ لے کر آیا ہے، بلکہ اس لئے کہ اس نے نوامیس فطرت کا مطالعہ کیا، متقدمین کے افکار کو نگاہِ تدبر سے دیکھا، اقوام غیر کے خیالات و جذبات سے متاثر ہوا، دیگر ممالک کے علوم و فنون کی نگاہداشت کی اور پھر رفتہ رفتہ اپنے ذہن رسا کی بدولت اس میں حدتیں پیدا کرتا گیا، نئی نئی باتوں کا تجربہ کرتا رہا اور آہستہ آہستہ تمام علوم و فنون کو خواہ وہ کسی ملک و قوم کے ہوں اس طرح اپنا بنا لیا، گویا اسی کے "زائیدہ ہائے دماغ" تھے، یقیناً افراد سے قوم بنتی ہے اور ترقی افراد سے نہضت قومی وجود میں آتی ہے لیکن بعض اقوام کی ذہنیت قدرتاً اس کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے اور بعض کی قدامت پرستی مشکل سے اپنے افراد کو ابھرنے دیتی ہے اور یہی وہ نمایاں فرق ہے جو اس وقت مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ وہاں ہر اچھی چیز مقبول ہے خواہ وہ کہیں کی پیداوار ہو کسی دماغ کا نتیجہ ہو اور یہاں ہر جدید بات ایک شجر ممنوع ہے ایک خطرناک راستہ ہے۔ وہاں ہر لمحہ میں اختراعات جدیدہ کے ساتھ ساتھ سیکڑوں جدید محاورات و الفاظ، ہزاروں نئے نئے اسلوب بیان پیدا ہوتے جاتے ہیں اور ملک ان کو قبول کر رہا ہے۔ یہاں کا یہ عالم ہے کہ منہ سے بات نکلنے بھی نہیں پاتی کہ چاروں طرف سے صدا بلند ہوتی ہے کہ لاؤ سند، دکھاؤ کسی استاد کا شعر بتاؤ کسی پرانے استاد کی تحریر۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب خود ہمارے علوم کو زندہ کر کے سیکڑوں نئے علوم و فنون کا مخترع ہو گیا اور مشرق نزاعات لفظی میں پڑ کر اپنا ذاتی سرمایہ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھا۔

بعض کا خیال ہے کہ مستشرقین یورپ کی خدمات اس قدر زیادہ اہم نہیں ہیں کیونکہ ان کا مطالعہ بالکل سطحی ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس حقیقت سے بھی انکار ہو سکتا ہے کہ ہمارے بہت سے علوم آج انھیں کی وجہ سے زندہ ہیں اور ہماری ہزاروں کتابیں انھیں کی علم پرستی کی بدولت اس وقت ہمیں دیکھنے کو ملجاتی ہیں۔ ڈاکٹر فیلپ حتی نے علوم مشرقی کے ساتھ علماء مغرب کے اعتناء پر ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے اس کا اقتباس غالباً فایدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتا ہے کہ:-

"قرونِ وسطیٰ میں مغرب کے علماء یہود نے جو بہ سلسلۂ تجارت و تعلیم تمام یورپ میں منتشر تھے، عبرانی اور بعض دیگر آرامی زبانوں کی درس و تدریس کی طرف خاص توجہ کی اور اسپین کے یہودیوں نے خصوصیت کے ساتھ زبان عربی کی بڑی خدمت انجام دی انھیں میں سے جبوح[1]، ابن جناح[2] اور داؤد الفاسی[3] بھی تھے جنھوں نے

---

[1] ابو زکریا یحییٰ بن داؤد جبوح ۹۵۰ء میں بمقام مراکش پیدا ہوا۔ قرطبہ میں عمر بسر کی، یہ عربی نحو کا بڑا فاضل تھا، اس نے عربی نحو کے مطابق عبرانی کی نحو تیار کی اور اسی لئے اس کو ابو النحو العبرانی کہتے ہیں۔

[2] ابو الولید مروان بن جناح قرون وسطیٰ کا بڑا زبردست ماہر لسانیات تھا ۹۹۰ء کے قریب پیدا ہوا اور سرقسطہ میں وفات پائی۔

[3] فاسی کا زمانہ ۱۱۶۰ء سے لیکر ۱۲۳۵ء تک ہوا ہے۔ جنوبی فرانس کے ایک مقام تاربون میں پایا جاتا تھا، اس نے ابن جناح کی لغت کو پورا کیا۔

عبرانی زبان کے قواعد نحو مرتب کر کے طلبۂ مغرب کے لئے اس زبان کو یسیر الحصول بنا دیا۔

انھوں نے بہت سے علوم عربیہ کو بھی عبرانی زبان میں منتقل کیا اور اس باب میں خاندان تبون کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اس خاندان کا تعلق جنوبی فرانس سے تھا اور بارھویں تیرھویں صدی میں پایا جاتا تھا۔ اس خاندان کے افراد نے قسطا بن لوقا (بعلبک کا طبیب) اور اسحاق بن حنین کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

جب اہل مغرب کو علوم یونانی حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوئی تو عربی کتابوں ہی کی طرف رجوع کیا اور ان کا ترجمہ عبرانی میں کیا۔ عربی میں یہ کتابیں سریانی زبان سے کی گئی تھیں اور سریانی میں اصل یونانی سے، اس لئے عربی اور اصل یونانی زبان میں صرف ایک واسطہ درمیان تھا، تاریخ میں بعض ایسے مغربی عیسائیوں کا نام بھی ملتا ہے جو لغات سامی کا درس دیا کرتے تھے، چنانچہ منجملہ اُن کے نکولس دی لیرا (Nicolus de Lyra) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے تورات کی شرح لکھی اور اصل عبرانی زبان سے اس کا مقابلہ کیا یہ فرانس کا راہب تھا اور ۱۲۶۵ء سے ۱۳۴۹ء تک زندہ رہا۔

چونکہ اندلس وصقلیہ کے عرب اپنے مقام پر جغرافی کی وجہ سے شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ کے احوال سے زیادہ واقف تھے اور ان کے علوم آسانی سے یورپ میں شایع ہو سکتے تھے، اس لئے علماء مغرب نے اس طرف بھی کافی توجہ کی، ۱۰۰۳ء میں پوپ سلوستر ثانی نے علوم عربیہ کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا اور تیرھویں صدی میں اسپین کے ایک راہب ریمن لل (Raimon Lull) نے یورپ کی درسگاہوں میں عربی زبان کے اساتذہ مقرر کئے، تاکہ وہ طلباء جو ممالک اسلامی میں سیر و سیاحت یا تفتیش و تحقیق علمی کے لئے جانا چاہیں ان کو آسانی پیدا ہو جائے۔

ان طلباء میں سب سے پہلا وہ شخص جس نے وسط ایشیا کی سیاحت تیرھویں صدی میں کی، کاربینی (Carpini) تھا اور مارکوپولو کی سیاحتیں بہت مشہور ہیں۔

چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہالینڈ کے ایک عالم جان وسل (Johnan wessel) نے عبرانی زبان حاصل کی اور اس کے بعد عربی حاصل کر کے کامل سات سال تک اطالیہ و فرانس کی مختلف درسگاہوں میں پھر کر دیگر لغات شرقیہ حاصل کیں۔ یہ عربی، کلدانی اور عبرانی زبانوں کا بڑا زبردست عالم تھا۔

جب پندرھویں صدی کے آخر میں فن طباعت کا رواج ہوا اور پروٹسٹنتی انقلاب رونما ہوا، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسفار مقدسہ کا مطالعہ اصل زبان میں کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں عبرانی زبان کی طرف لوگوں کو بہت توجہ ہوئی اس زمانہ میں کونارڈ پلی کانس (Conard Pellicanus) (۱۴۷۸ء - ۱۵۵۶ء) نے بڑی شہرت حاصل کی، یہ الزاس میں پیدا ہوا تھا اور جرمنی نسل کا تھا۔ ۱۵۰۶ء میں جرمنی کے ایک عالم جان روشلین (John Reuchlin) اپنی کتاب "مبادی لغت عبرانیہ" پر شایع کی جس نے اس زبان کے درس میں بہت آسانی پیدا کر دی۔

اس زمانہ میں فرقہ پروٹسٹنٹ کے لوگ لاطینی زبان سے توریت کے ترجمے جرمنی اور دیگر یوروپی زبانوں میں کر رہے تھے اس لئے ان کے فریق مخالف کیتھولک فرقہ نے مسیحی یہودیوں کی مدد سے توریت کے اصلی نسخوں کا مطالعہ کیا اور اصل زبان میں مطالعہ کر کے، اس کی تفسیر و شرح رائج زبانوں میں کی۔

سب سے پہلا نسخہ توریت کے ترجمہ کا وہ تھا جسے ۱۵۱۴ء میں کارڈنل زنس (Xeminus) نے شایع کیا تھا، اس میں اصل عبرانی عبارت کے ساتھ ساتھ اطالوی اور یونانی ترجمے بھی دئے گئے تھے اور اس کے بعد ۱۵۶۲ء میں آٹھ جلدوں میں اینٹورپ (بلجیم) سے شایع ہوئی۔ اس میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ عہد جدید کا حصہ سریانی زبان میں تھا، پھر ۱۶۲۵ء میں لاجائی (Lejay) سے ایک نسخہ شایع ہوا جس میں عہد قدیم کا حصہ سریانی زبان میں تھا۔

سترھویں صدی میں علوم شرقیہ کی طرف اور زیادہ توجہ ہوئی علوم عربیہ میں جان بکسٹورف (jhon Buxtorf) جرمنی عالم اور جین مورن (jean morin) اور کاپل (Louis Cabelle) خاص شہرت حاصل کی، سریانی زبان کے نحو کی ایک کتاب (۱۶۳۳ء میں) جرجس میکائیل نے شایع کی، لیکن اس سے قبل ۱۶۲۸ء میں ابراہیم الحاقلانی اس کی ابتدا کرچکا تھا۔

اس عہد میں صرف عربی، عبرانی اور سریانی ہی کی طرف توجہ نہیں کی گئی بلکہ فارسی، سنسکرت، چینی، جاپانی زبانوں کی طرف بھی اعتناء کیا گیا موخرالذکر دو زبانوں کا لغت بھی مرتب کیا گیا۔ مغرب کا وہ سب سے پہلا عالم جس نے ہندوستان سے پانچ سال رہ کر سنسکرت کو حاصل کیا۔ فلپوستی (Fillipho Sanetti) تھا۔ اس کا زمانہ ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۸ء تک ہوا ہے، اسی نے سب سے پہلے یہ ظاہر کیا کہ اطالوی اور سنسکرت زبانوں میں باہم لسانی علاقہ پایا جاتا ہے۔

فارسی کی سب سے پہلی گیجی (Giggei) (۱۶۳۲ء) اور اگناٹوئس ڈی جیسو (Ignatius de Jesu) نے (۱۶۶۱ء) میں حاصل کیا۔

اسی طرح قبطی زبان میں جرمنی کے ایک عالم کرشر (Athanasius Kirsher) کا شہرہ ہوا۔ (۱۶۰۱-۸۰ء) حبشی زبان میں لوڈلف (Job Ludolf) نمایاں خدمت انجام دیں اور ترکی زبان میں دی بریو (Savary de Breves) مگستر (Megister) اور مولینو (Molino) فرانسیسیوں کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

قرآن مجید کا ترجمہ ۱۱۴۳ء میں سب سے پہلے اطالوی زبان میں کیا گیا تھا، مترجم کا نام رابرٹ کنٹ (Robert Kennet) تھا اس کے بعد یورپ کی دوسری زبانوں میں ہوا حتیٰ کہ آج کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں متعدد ترجمے اس کے نہ کئے گئے ہوں، انگلستان میں سب سے پہلے ۱۷۳۴ء میں سیل (Sale) نے ترجمہ کیا۔

قرون جدیدہ میں ہالینڈ سے زیادہ مشرقی علوم علی الخصوص عربی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، اس کا سبب شاید یہ تھا کہ قرون وسطیٰ میں ہالینڈ کا ہندوستان سے تعلق تھا۔ اس وقت لیڈن (Leyden) اشاعت علوم مشرقیہ کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتا ہے یہاں تک کہ اگر قاہرہ کے مطبع بولاق کو علحدہ کردیا جائے تو اس وقت دنیا میں کوئی مطبع ایسا نہیں ہے جو مطبع بریل (Brill) سے زیادہ عربی زبان کی خدمت کررہا ہے۔

ہالینڈ کے اساتذہ میں سے سب سے پہلے تامس ارپائینوس (Thomas Erpenius) (۱۵۸۴-۱۶۲۴ء) نے ایک مصری عالم سے عربی زبان حاصل کی، پھر وینس جاکر ترکی، فارسی اور حبشی زبانیں حاصل کیں جب ۱۶۱۳ء میں یہ لیڈن واپس آیا تو وہاں کی یونیورسٹی میں شرقی زبانوں کا پروفیسر ہوا، اسی زمانہ میں پیرس کے اندر ایک مطبع عربی کا قایم ہوچکا تھا، اس لئے ارپائینوس نے بھی لیڈن میں ایک مطبع عربی کا اپنے مصارف سے قایم کیا، اس کی اہم تالیفات میں ایک عربی کی کتاب قواعد ہے جس نے اسے ۱۶۱۳ء میں شایع کیا تھا اور امثال لقمان اور بعض امثال عرب کے علاوہ شیخ جرجس ابن النعمیہ بن ابی المکارم بن ابی الطیب کی تاریخ المسلمین ہے۔ یہ عربی و لاطینی دونوں زبانوں میں ہے اور ۱۶۲۵ء میں بمقام لیڈن شایع ہوئی تھی۔

جب ۱۶۲۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کا ایک شاگرد گولیوس (jacobus golius) اس کی جگہ مقرر ہوا۔ اس نے چار سال تک سوریا اور بلاد عرب میں سیاحت کرکے تحصیل علوم کی۔ اس کی اہم تالیف عربی لاطینی لغت ہے۔

اس جامعہ کے مشہور اساتذہ میں سے ایک البرٹ شولٹن (Albert Schultens) (۱۶۸۶-۱۷۵۰ء) بھی تھے، ۱۷۳۲ء میں یہ السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ یہ اپنے زمانہ میں یورپ کے سب سے بڑے ماہر عربی زبان کے سمجھے جاتے تھے، اب لغات شرقیہ کی کرسی پر لیڈن میں سنوک ہرگرونیہ (Snouck Hurgronje) متمکن ہیں۔

اہل برطانیہ میں سب سے پہلے پوکوک (Pococke) (۱۶۰۴-۱۶۹۱ء) نمودار ہوا، اس نے حلب کے دوران قیام میں

عربی حاصل کی اور ۱۶۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے تعلیم عربی کی کرسی اس کو پیش کی - یہی وہ کرسی ہے جس پر آج کل پروفیسر مرگلیوتھ متمکن ہیں - اس کے بعض تالیفات بہت مقبول ہوئیں، اُنیسویں صدی میں ایڈورڈ ولیم لین اور ولیم میور نے بھی خاص شہرت حاصل کی۔

فرانس میں اٹھارویں صدی کا مشہور ترین مستشرق بارتھلمی (Barthelamy) تھا۔ اسی نے سب سے پہلے نقوش فنیقیہ کا ترجمہ شروع کیا، اور اس کے بعد سلوسٹری دی ساسی (Sylvestre de Sacy) ہوا جو پیرس یونیورسٹی کا پہلا پروفیسر عربی تھا۔ اس نے ۱۸۱۰ء میں عربی قواعد پر ایک کتاب لکھی اور اسی نے پہلوی رسم الخط کے رموز کا انکشاف کیا۔ کلیلہ دمنہ اور مقامات عریری اسی کی سعی و کاوش سے یوروپ میں منصۂ شہود پر آئیں۔

فرانس کا ایک اور مستشرق گالان (Antoine Galland) بھی بہت مشہور ہے جس نے سب سے پہلے الف لیلہ سے یورپ کو روشناس کیا، اُنیسویں صدی کے مستشرقین میں باربر دی مینارڈ (Berber de Meynard) نے خاص امتیاز حاصل کیا اور سلان (M. De Slane) بھی بہت مشہور ہوا۔ اول الذکر نے تاریخ سعودی معہ فرانسیسی ترجمہ کے شایع کی اور موخرالذکر نے ابن خلکان کو شایع کیا اور ابن خلدون کا ترجمہ کیا۔

اجتماعی حیثیت سے علوم مشرقی کی ابتداء ۱۸۲۲ء سے ہوتی ہے، جب سب سے پہلے پیرس میں ایک جماعت ایشیاٹک سوسائٹی کے نام سے قایم ہوئی، اس سے مقصود یہ تھا کہ فرانس کے تمام مستشرقین ایک رشتہ سے وابستہ ہوکر متفقہ کوشش کے ساتھ علمی تحقیقات میں مصروف ہوں، اس کے سالانہ جلسوں میں رفتہ رفتہ تمام یورپ کے مستشرقین شرکت کرنے لگے اور بہت سی نادر کتابیں اس نے شایع کیں، اس سوسائٹی کا ایک رسالہ بھی تھا جو جرنل ایشیاٹک کے نام سے شایع ہوتا تھا۔

فرانس کی دیکھا دیکھی برطانیہ نے بھی ۱۸۲۳ء میں ایک جماعت رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے نام سے قایم کی ہے اور اسی نام سے جاری کیا اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں اہل امریکہ نے ایک سوسائٹی امریکن اورینٹل سوسائٹی کے نام سے جاری کی جو اس وقت تک موجود ہے اور بہت ترقی کر رہی ہے اور اس کا ایک رسالہ بھی اسی نام کا ہے۔

۱۸۴۴ء میں اہل جرمنی نے بھی اسی مقصد سے ایک سوسائٹی قایم کی اور رسالہ بھی جاری کیا، اس سوسائٹی کی خدمات بھی بہت اہم ہیں جن کے سلسلہ میں نولڈکی (Nolodke)، کارل براکلمین (Brocklemen) ہرتھمان (Hartzman) بکر (Becker) اور دلہوزن (Well Hausen) مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں، کیونکہ انھوں نے علوم اسلامیہ اور فنون مشرق کی نہایت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

اس کے بعد اطالیہ اور روس میں بھی سوسائٹیاں قایم ہوئیں اور ڈنمارک و بلجیم نے بھی تقلید کی۔

نگار کے پچھلے فایل

۳۲ء = جولائی تا دسمبر = ——— = ۸ء	۴۴ء = جولائی تا دسمبر = ——— = ۸ء
۳۷ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ حجاب، کہف و خلافت نمبر) = ۱۵ء	۴۶ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ انتقاد نمبر) = ۱۵ء
۳۹ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ مصحفی نمبر) ... = ۱۵ء	۴۷ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ ماجد و لین نمبر) = ۱۵ء
۴۰ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ تصویر نمبر) .... = ۱۵ء	۵۰ء = جنوری تا دسمبر = (سالنامہ تنقید نمبر) = ۱۵ء

نوٹ :- صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا - قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

روسی چاند

(فضا ابن فیضی)

روشنی سائنس کے جلووں سے لیکر روس نے
چاند کی مشعل جلائی ہے زمیں پر روس نے

اے حصارِ آہنیں، اے روس، محسودِ فرنگ
صاعقہ پارے تری شبنم کو دیتے ہیں خراج
تیرے ذہنِ فکر کی رفتار کتنی تیز ہے
دیکھ کر یہ انکشافاتِ جدیدہ کا خروش
عقل، ایجادات کا نشہ پلاتی ہے تجھے
تو نے ذرّوں کے گریباں سے نکالے آفتاب
چاند کی دنیائے نادیدہ میں جانے کے لئے
تجربے تو کر رہا ہے نت نئی پرواز کے
کیا قیامت ہے کہ تیری شوخیٔ رنگِ ہنر
چاند تیرا ارتقا ہے تیرے فکری دور کا
یہ خلا کی وسعتوں کے تجزئے کا باب ہے
فلسفے کی ناکشودہ گتھیوں کا حل ہے یہ
مسئلہ ہے اک نیا علمِ طبیعیات کا
ارتقا کی گونج ہے رجعت زدہ ماحول میں
ریڈیائی لہر سے پیغام ملتے ہیں تجھے

اے اٹیمی مرغزاروں کی بہارِ لالہ رنگ
تیرے فرقِ ناز پر ہے "جوہری کرنوں" کا تاج
قوتِ ادراک تیری کتنی حیرت خیز ہے
تجربے کا ارتقا ہے آج خود حیرت فروش
ساز پر آلات کے نغمے سناتی ہے تجھے،
تو نے "سیاروں" کے خوشوں سے نچوڑی ہے شراب
رہگزر کوئی سرِ گردوں بنانے کے لئے
تو نے طیارے بنائے ہیں نئے انداز کے،
چاند بن کر تیرتی ہے سینۂ افلاک پر
عطر ہے چالیس سالہ تجرباتی دور کا
آسماں کی خاک اس کی موج سے سیراب ہے
کھیت پر سائنس کے اڈا ہوا بادل ہے یہ
درس ہے فطرت کی نامعلوم کیفیات کا
بند روحِ عصر ہے المونیم کے خول میں،
ٹیلی ویژن نے عطا کی ہیں "نئی آنکھیں" تجھے

تو انھیں آنکھوں سے لیتا ہے خلا کا جایزا
جونگاہوں سے ہے اوجھل اس فضا کا جایزا

جاگ اُٹھے ہیں وقت کے خوابیدہ احساسات بھی
تجربے کی روشنی سے دن بنی ہے رات بھی

مایلِ پرواز ہے ہر شے بلندی کی طرف
دیکھتی ہیں رفعتیں حیرت سے پستی کی طرف

تو نے پھینکی ہے فضا کی بیکرانی پر کمند
دوڑتا ہے "وادیِ آفاق" میں تیرا "سمند"

کھنچ گئی آکاش کے ماتھے پہ اک "روشن لکیر"
یہ ترا راکٹ ہے "سیاروں" کی دنیا کا سفیر

اب ستارے خاک کی میزاں میں تولے جائیں گے
فرش پر افلاک کے اسرار کھولے جائیں گے

ہر اندھیرا رفتہ رفتہ روشنی میں آئے گا
عرش و کرسی پر علم انسان کا لہرائے گا

ٹیلی ویژن کے یہ سسٹم یہ شعاعوں کی مشین
کر رہا ہے آدمی "برقی کرہ" کی چھان بین،

یہ خرد کی ناخدائی ہم کو لے آئی کہاں
چھو رہا ہے آج قدموں کو ستاروں کا جہاں

بس یہاں سے "وادیِ مہتاب" تھوڑی دور ہے
"زہرہ و خورشید" کی محراب تھوڑی دور ہے

دو قدم ہے "جلوہ گاہ کہکشاں" کا راستہ
وہ نظر آیا زمیں سے آسماں کا راستہ

یہ خلاؤں کے سمندر میں سبک لہروں کے جال
ہو رہا ہے ریڈیو کی گت پہ "رقصِ ماہ و سال"

جو "خبر" ہے آج وہ کل "مبتدا" ہو جائے گی
"محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی"

بال افشاں ہے اب انساں رفعتِ افلاک پر
کہکشاں قشقہ لگاتی ہے جبینِ خاک پر

زرفشاں خورشید کی رنگیں کلاہی کی قسم
تیری شب کے تاج کا ہیرا ہے یہ "ماہِ عجم"

چاند کے تاریک غاروں سے جھلکتی ہے سحر
ہیں صدف زاروں میں تیرے اور بھی کتنے گہر؟

عظمتِ دیرینہ کی تجدید اور اس رنگ سے
پھوٹ نکلا سیلِ حیرت وادیِ افرنگ سے

تولتا ہی رہ گیا امریکہ بازو ہوش کے
کر گیا تو نیلگوں صحرا کی پہنائی کو طے،

عقل کی بازی گری میں سب سے بازی لے گیا
دوسروں نے کان کھودی اور تو چاندی لے گیا

فکر کا یہ ارتقا تسلیم —— لیکن اے ندیم!
کھا نہ جائے اپنے ہی پھولوں کو یہ بادِ نسیم

اپنی ہی ساحل سے یہ کشتی نہ آنکھیں پھیر لے
اس مسافر کو نہ آندھی راستے میں گھیر لے

اپنی ہی شبنم کو پی جائے نہ یہ ظالم کرن
یہ اُجالے اپنی صبحوں کا نہ بن جائیں کفن

چھب انوکھی ہے تری، تیور نرالے ہیں ترے
کچھ تو کہہ اے روس آخر کیا ارادے ہیں ترے؟

کس بناء پر ارتقا کی یہ عمارت ہے کھڑی
عقل کا یہ شعبدہ ہے یا کہ جادو کی چھڑی

کیا مقاصد تجربے کے اسکے پس منظر میں ہیں
"عرض" کتنے حجلہ آرا پردۂ "جوہر" میں ہیں

چاند سے کیا رات کے گیسو سنوارے جائیں گے؟
کیا زمیں کی کوکھ سے سورج اُبھارے جائیں گے؟

کیا اندھیروں سے خلیجِ نور پاٹی جائے گی؟
چلچلاتی دھوپ بوکر چھاؤں کاٹی جائے گی؟

کیا چڑھائے گی خزاں نسرین و گل پر آب و رنگ؟
ہیڈروجن کیا اُڑائے گی "جہازوں" کی پتنگ؟

بجلیوں کی موج سے کیا فصل سینچی جائے گی؟
ریڈیائی لہر پانی کھیت پر برسائے گی؟

کیا ٹرنسو میٹروں کی "خواب گوں آواز" سے
حل کئے جائیں گے نکتے "اقتصادیات" کے؟

کیا "ادب اور شعر" طیاروں میں ڈھالے جائینگے؟
راکٹوں سے "امن کے پرچم" تراشے جائیں گے؟

کیا نئی سائنس کے آلات لکھیں گے "غزل"؟
داد دے گا کیا فضاؤں کا "سکوتِ برمحل"؟

وضع فرمائیں گے کیا آلات "اخلاقی اصول"
کیا بکھیرے گی "تمدن" کی کرن ایٹم کی دھول؟

کیا خلا میں "رقص" کی محفل سجائی جائے گی؟
چرخ پر سائنس اکیڈیمی بنائی جائے گی؟

ایٹمی ذروں سے کیا دنیا بنائی جائے گی؟
فلسفے کی خاک سے "تہذیب" اگائی جائے گی؟

کیا "شعاعوں" سے سئے جائیں گے پیراہن نئے
چاند کے غاروں میں ڈھونڈھے جائیں گے مسکن نئے؟

کیا مشینوں سے "نئے انسان" ڈھالے جائیں گے؟
وقت کے آغوش میں طوفان پالے جائیں گے؟

کیا سجائے جائیں گے برقی کُرے آلات سے؟
کیا محل تعمیر ہوں گے "تجربے کی دھات" سے؟

کیا زمیں کو چاند کے محور پر لایا جائے گا؟
نوعِ انساں کو خلاؤں میں بسایا جائے گا؟

اس نئی دریافت کے مہلک نتائج سوچ کر
کانپتی ہیں منزلیں، سہمے ہوئے ہیں رہگزر،

یہ جنونِ نو یہ پندارِ ہلاکت آفریں
ناخدائی عقل کی طوفاں نہ بن جائے کہیں،

تیرے ذہنِ ارتقا، ایجاد کا افسونِ تیز،
بن کے ننھا چاند کتنی دیر سے ہے شعلہ ریز

تیری دُنیا سے مگر یہ چاند جب ٹکرائے گا
خود تری ایجاد سامانی کو ہوش آجائے گا

شفقت کاظمی

کبھی کبھی کے تصور سے دل نہیں بھرتا
مرے خیال میں آؤ تو بار بار آؤ،

نہ آئے راس دیارِ طرب کے ہنگامے
پھر آگیا ہوں مسافر نواز صحراؤ

مریضِ غم کو بہر حال جان دینا تھی
اب اپنی غفلتِ بیجا پہ تم نہ پچھتاؤ

مجھے بھی قافلے والو ذرا خبر دینا
کہیں جو منزلِ مقصود کا پتہ پاؤ

مرے الم کا ہے یارو اگر تمھیں احساس
دوائے دردِ محبت کہیں سے لے آؤ

بڑا کٹھن ہے غمِ دل کا راستہ شفقت
خیال یار کی لہروں سے کھیلتے جاؤ

بادہ اپنا ہے اب نہ جام اپنا — تم کو اے مغبچو سلام اپنا
کتنی آباد تھی گلی تیری — جتنی مدت رہا قیام اپنا
ہم کہاں پھر ترا دیار کہاں — کوئی دن اور ہے قیام اپنا

قاسم شبیر نقوی

خیالِ سود و زیاں سے بچ کر ہر اک مقامِ خطر سے گزرے — "اداشناسِ حیات" وہ ہے جو منزلِ تیغ و سر سے گزرے
بھٹک گئے رہبرانِ منزل بھی، آپ کی راہِ جستجو میں — جنھیں بھروسہ تھا آگہی کا وہ اور بھی بے خبر سے گزرے
اگر تلاشِ سحر کا مقصد، ہے روشنی صرف اپنے گھر کی — تو ایسی کوشش سے باز آئے، ہم آرزوئے سحر سے گزرے
سفینۂ زندگی نے میرے بنائے ہر ہر قدم پہ ساحل — ہزار موجوں نے سر اٹھایا ہزار طوفان سر سے گزرے

مطبوعات موصولہ

اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ

۵۷ء میں حکومت پاکستان نے طے کیا تھا کہ آزادی ہند کی تحریک میں مسلمانوں نے جتنا حصہ لیا ہے اسے تاریخی حیثیت سے مرتب کرنا چاہئے اور اس کے لئے ایک بورڈ بنا دیا گیا جو وہاں کے خاص خاص اہل علم پر مشتمل تھا۔ لیکن بعض موانع کی وجہ سے جو ہر نئے اور بڑے کام میں اول اول حایل ہوتے ہیں، یہ بورڈ بھی کوئی عملی اقدام جلد نہ کر سکا۔ تاہم خوشی کی بات ہے کہ اس سے بالکل غافل نہیں رہا اور آہستہ آہستہ منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہی رہا، یہاں تک کہ اس تالیف کی پہلی جلد تصحیف وطباعت وغیرہ کے دشوار گزار مراحل سے گزر کر پبلک کے سامنے آگئی۔

یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور بیس ابواب پر منقسم ہے۔ جنھیں مختلف حضرات نے لکھا ہے۔ پہلا باب جسے تمہید کہنا چاہئے، جناب پروفیسر قریشی کا لکھا ہوا ہے اور اس میں انھوں نے نہایت قابلیت و جامعیت کے ساتھ ہندوستان کی پوری اس تاریخ کا ملخص پیش کر دیا ہے جو مسلمانوں کی آمد سے لیکر تقسیم ہندوستان کے واقعات تک پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں سلطنت مغلیہ کے اسباب زوال پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تیسرے چوتھے باب میں جانشینان اورنگ زیب کا ذکر ہے جو شاہ عالم پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ پانچویں باب میں سکھوں کے عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے اور چھٹے باب میں مرہٹوں کے کارناموں پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ ساتویں باب میں اودھ کے نائب وزیروں کا ذکر کیا گیا ہے اور آٹھویں باب میں مسٹر اے رحیم نے آصف جاہ اول کا۔ نواں باب احمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی تیسری لڑائی سے متعلق ہے اور دسواں روہیلوں سے۔ گیارھویں باب میں بنگال کی تحریک آزادی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بارھویں باب میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر۔ اس کے بعد تین ابواب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے کارناموں کا ذکر ہے اور پھر دو ابواب میں مولانا شاہ ولی اللہ کی مذہبی تحریک پر بحث کی گئی ہے۔ اٹھارویں باب میں ان مذہبی اصطلاحات کا ذکر کیا گیا ہے، جو حاجی شریعت اللہ نے بنگال میں کیں۔ آخری ابواب شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید سے متعلق ہیں اور اس طرح یہ پہلی جلد ۱۷۰۷ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۱ء پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہ تمام ابواب مختلف اکابر فضل و کمال کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں اور تمام ان خصوصیات کے حامل ہیں، جو ایک تاریخی کتاب کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک مورخ کا فرض ہے کہ جو کچھ وہ لکھے بہت صاف و شگفتہ ہو اور ذاتی جذبات و رجحانات سے معرا۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم کو یہ دونوں خصوصیتیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔

اس کتاب کے باقی تین حصے جن کی اشاعت پیش نظر ہے ۱۸۳۱ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کے حالات پر مشتمل ہوں گے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ کام انجام کو پہونچ گیا تو یہ پاکستان کی بڑی زبردست علمی و تاریخی خدمت ہوگی۔

اس کتاب کی یہ تالیفی خصوصیت کہ وہ تاریخ کی کوئی بوجھل کتاب نہیں بلکہ ایک مسلسل دلچسپ داستان نظر آتی ہے، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے اور ہمیں امید ہے کہ آیندہ حصوں میں بھی اس خصوصیت کو قایم رکھا جائے گا۔

یہ کتاب نہایت اہتمام سے بہت اچھے روشن ٹائپ میں مجلد شایع کی گئی ہے اور پچیس روپیہ میں ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی سے مل سکتی ہے

دارورسن کی آزمایش

اردو ترجمہ ہے روسی ادیب نکولائی آسترادسکی کے سب سے پہلے ناول کا اور اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب دوسری جنگ عظیم کے بادل دنیا پر منڈلا رہے تھے اور روسی عوام بڑی آبادھاپی میں مبتلا تھے۔

اس ناول کا مقصود صرف یہ تھا کہ روسی نوجوانوں کو فاسزم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے اُبھارا جائے اور اس مقصد کو جس تکمیل کے ساتھ فاضل مصنف نے پورا کیا ہے اس کا صحیح علم و احساس اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کی تخلیقی صداقت کا سبب صرف یہ ہے کہ آسترادوسکی نے اس میں خود ہی اپنی زندگی کے نشیب و فراز، خود اپنے جذبات کے تلاطم اور خود اپنے تلخ احساسات کے نتائج کو پیش کیا ہے جو اس وقت کے بہت سے مظلوم روسی عوام کے دلوں کو بے چین بنائے ہوئے تھے۔

محض فن کی حیثیت سے یہ ناول اتنے اونچے درجہ کا ہے، کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہم کو دوسری زبانوں کے ناول بڑے حقیر _____ نظر آنے لگتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ مصنف اپنے مطالعۂ فطرت کی وسعت و نزاکت کو کیونکر ایسی کامیابی کے ساتھ الفاظ میں پیش کر سکا۔ ترجمہ بہت سلیس و رواں ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷ صفحات کو محیط ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ پیپلس پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مراسلت کی جائے۔

ماں میکسم گورکی کے مشہور ناول کا ترجمہ جسے غیر ملکی زبانوں کے دارالاشاعت ماسکو نے شایع کیا ہے۔ گورکی کی یہ کتاب روسی ادب کی نہایت مشہور و مقبول تصنیف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انقلاب زار (۱۹۰۵ء سے پہلے) روسی عوام کس صبر آزما دور سے گزر رہے تھے اور وہاں کا کسان و مزدور کن ناقابل برداشت مصائب میں مبتلا تھا۔

یہ ناول روس کے انقلابی ادب میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک امارت زدہ ملک کے عوام میں بے چینی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ جب انسان تنگ آکر دولت و امارت کے دام سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر دُنیا کی کوئی اذیت و مصیبت ایسی نہیں جس کے جھیل جانے پر وہ آمادہ نہ ہو جائے۔ یہ صرف ایک مزدور خاندان کی سرگزشت ہے، لیکن گورکی نے اپنی غیر معمولی تجزیہ نگاری سے اس میں اتنے عجیب و غریب نقوش اُبھار دئے ہیں کہ مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور نگاہ دوررس کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بال کی کھال نکالنے والی خصوصیت جیسی ہم کو روسی ادیبوں میں نظر آتی ہے، وہ کسی دوسری زبان کے لٹریچر میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے۔

کتاب نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں مجلد شایع کی گئی ہے۔ ضخامت ۵۵۸ صفحات۔ ملنے کا پتہ :-

پیپلس پبلشنگ ہاؤس لمیٹیڈ ام۔ ام روڈ۔ نئی دہلی۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ناقابلِ فراموش سوانح حیات ہیں سردار دیوان سنگھ مفتوں اڈیٹر ریاست کے جنھیں خود انھوں نے قلمبند کیا ہے۔ سردار دیوان سنگھ، ہندوستان کی صحافتی دُنیا کے بہت مشہور فرد ہیں اور ان کے بہت سے ہنگامہ خیز کارنامو سے دُنیا واقف ہے، لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دیوان سنگھ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کس قدر عجیب و غریب شخص ہیں: ان کی ساری زندگی ابتداءِ عہدِ طفلی سے اس وقت تک ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے ہی میں گزری اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے کامیابی حاصل نہ کی ہو۔

دیوان سنگھ بڑے سخت جان انسان ہیں اور ان کی داستانِ حیات کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جو ان کی سخت جانی کے ذکر سے خالی ہو اور اسی لئے ان کی یہ کتاب جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات نہایت دیانت کے ساتھ صاف صاف لکھدئے ہیں، نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز بھی ہے۔ ہر چند اس میں کوئی تاریخی تسلسل نہیں پایا جاتا، لیکن باوجود "ترتیب پریشان" کے وہ ایک تذکرہ کی سی جامعیت و دلکشی سے خالی نہیں۔

اپنی زندگی سے ہٹ کر دوسروں کے متعلق بھی انھوں نے کہیں کہیں اظہارِ خیال کیا ہے اور اس سلسلہ میں یقیناً بعض باتیں خلافِ حقیقت ان کے قلم سے نکل گئی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے بعض احباب کو پوری طرح پہچاننے کی کوشش نہیں کی اور بربنائے سادگی

ان کی ہر بات کو باور کرلیا۔ یہ کتاب نہایت اچھے کاغذ پر شایع کی گئی ہے اور دس روپیہ میں دفتر ریاست دہلی سے مل سکتی ہے۔

ذکر میر

اُردو ترجمہ ہے میر کے خود نوشت سوانح کا جو ذکر میر کے نام سے انھوں نے فارسی میں لکھے تھے۔ سب سے پہلے اس کا ملخص ترجمہ ۱۹۲۶ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اُردو میں شایع کیا اور پھر ۱۹۲۸ء میں اسے فارسی متن کے ساتھ کتابی صورت میں یہ ترجمہ جناب نثار احمد صاحب فاروقی نے کیا ہے اور ان تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر جو مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ابتدا میں جناب مالک رام کا مختصر سا مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے ذکر میر کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر خود مترجم نے اس کتاب کی ادبی اہمیت اور زمانۂ تالیف پر اظہار خیال کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خود میر کے اسلاف کا ذکر اس میں پایا جاتا ہے وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں کیونکہ اس کی بنیاد محض خوش اعتقادی پر قایم ہے لیکن جس حد تک ۵۷ء کے ہنگامہ اور اس کے بعد کے حالات و واقعات کا تعلق ہے یہ کتاب تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے اور ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ شایع کیا جاتا۔

ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے اور فاضل مترجم کے حواشی سے اس کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کتاب بہت سلیقہ سے مجلد شایع کی گئی ہے اور ڈھائی روپیہ میں مکتبۂ برہان جامع مسجد دہلی سے مل سکتی ہے۔

انقلاب روس اور اس کے بعد

تصنیف ہے جناب محمد مسعود جوہر کی جس کے پہلے حصہ میں فاضل مصنف نے انقلاب روس کی داستان بیان کی ہے اور دوسرے حصہ میں انقلاب کے بعد ۱۹۲۵ء سے لے کر اسوقت تک کے سوویٹ حکومت کے سیاسی و معاشی حالات پر اظہار خیال کیا ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ سوویٹ حکومت کے حالات سے لوگوں کی دلچسپی برابر بڑھتی رہی ہے اور اشتراکیت کا مطالعہ بہت ضروری ہوگیا ہے، لیکن اس وقت تک سوویٹ حکومت یا اشتراکی تحریک کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں حقایق کے ساتھ مبالغہ بھی شامل رہا ہے یہاں تک کہ اب بھی اکثر حضرات اشتراکی تحریک کی معقولیت اور سوویٹ حکومت کے طریق سیاست کی طرف سے مشتبہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سوویٹ حکومت کا وہ دور جو لینن سے شروع ہوکر اسٹالین پر ختم ہوا، اپنی جگہ بڑی بنیادی اہمیت رکھتا تھا، لیکن تھا بہرحال وہ برزخی دور، جس سے روس کو نکلنا تھا اور اب سوویٹ حکومت کا بھی تازہ ذہنی انقلاب معرض بحث میں ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قوی محرک جس نے عہد اسٹالین کی خصوصیات کو ختم کرنا چاہا، روس کی اندرونی سیاست نہیں بلکہ اس کی خارجی سیاست تھی جس پر چین اور بعض دوسری حکومتوں کے اشتراکی ہوجانے کی وجہ سے گہرا اثر پڑا اور سوویٹ حکومت کو "روس کی حدود سے باہر" ہوکر بھی اس پر غور کرنا پڑا کہ اسے آفاقی حیثیت کیونکر دیجا سکتی ہے اور موجودہ دور اسی نوع کی حرکت و عمل سے تعلق رکھتا ہے۔

ان تمام باتوں کے سمجھنے کے لئے یقیناً ایک واضح کتاب کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت بڑی حد تک اس کتاب سے پوری ہوجاتی ہے گو جن نتائج تک فاضل مصنف پہونچنا چاہتے ہیں وہ سب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس میں پوری تفصیل کے ساتھ بالشویک تحریک انقلاب روس اور سوویٹ حکومت کے قیام و اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا مطالعہ یقیناً دلچسپی اور فایدہ سے خالی نہیں۔

کتاب ۶۲۸ صفحات کو محیط ہے اور نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ برہان جامع مسجد دہلی۔

تنقیدیں

خورشید الاسلام کے بارہ انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے انجمن ترقی اُردو علیگڈھ نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔

خورشید الاسلام دور حاضر کے ان چند ادیبوں اور نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے مقالات کی کثرت نہیں بلکہ ان کی کیفیت سے اپنی جگہ پیدا کی اور اس طرح "بزور مشت" اپنی اہمیت تسلیم کرالینے والوں میں "خورشید الاسلام" کا ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ

انھوں نے جو راہ اختیار کی وہ بالکل اپنی راہ تھی جو مستقیم ہو یا نہ ہو لیکن تازگی و شادابی میں یقیناً اپنا مثل نہ رکھتی تھی اور اسی لئے جب اول اول ان کا مقالہ "شبلی" پر علیگڈھ میگزین میں شایع ہوا تو اس کے اندازِ بیان کی ندرت، خیال کی طرفگی اور طرزِ استدلال کو "بدعاتِ حسنہ" نے ہم کو دفعتاً چونکا دیا اور ہم ایسا محسوس کرنے لگے کہ یہ "نوائے نجی" کچھ نئی سی چیز ہے۔ اس کے بعد ان کے دو مقالے حالی اور خطوط نگاری پر نگار میں شایع ہوئے اور دنیائے ادب میں ان کو صد درجہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اس کے بعد ان کے اور متعدد مقالے رسایل و جرایدمیں شایع ہوئے، لیکن ان میں سب سے زیادہ طویل لیکن اس حد تک معیاری مقالہ وہ تھا جس میں انھوں نے رسوا کے مشہور ناول امراؤ جان ادا کا فنی، اخلاقی، معاشرتی اور ادبی تجزیہ کیا۔ خورشید الاسلام کا یہ مقالہ صرف انتقادی شاہکار ہی نہیں بلکہ ان کے فطری ذوق کی بھی بڑی زبردست دستاویز ہے جب لکھنے والا قلم سے زیادہ اپنی روح سے کام لیتا ہے۔

خورشید الاسلام کی ادبی زندگی ۴۵ء سے شروع ہوتی ہے (جب وہ علیگڈھ میں تعلیم پاتے تھے) جو اب سے بارہ سال قبل کی بات ہے لیکن اس کے بعد وہ ذہنی تعطل میں مبتلا ہو گئے اور ذہین آدمیوں میں عموماً جو عیب سہل انکاری کا پایا جاتا ہے" ان میں بھی پیدا ہو گیا۔

ہمیں افسوس ہوگا اگر ان کا یہ دورِ تعطل بدستور قایم رہا نہ صرف اس لئے کہ یہ اُردو ادب کا نقصان ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ اگر وہ اس سلسلہ کو جاری رکھتے تو بعض خامیاں جو ان کے اندازِ بیان میں پائی جاتی ہیں وہ بھی مشق و ممارست سے دور ہو جاتیں

اس مجموعہ کی قیمت چار روپیہ ۵۰ پیسے ہے۔

نغمہ زار

مجموعہ ہے حفیظ جالندھری کے "اولین مجموعۂ سخن" کا جو ترمیم و اضافہ کے ساتھ مع "شاعر کے خود نوشت حالات" کے حال ہی میں شایع ہوا ہے۔

یہ مجموعہ پندرہ نظموں اور ۳۵ غزلوں پر مشتمل ہے۔ حفیظ اپنے رنگ سخن کے لحاظ سے اتنے "جانے بوجھے" شاعر ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ حفیظ صحیح معنی میں فطری شاعر ہے اور جو کچھ اس کے قلم سے نکلتا ہے وہ محض فطرت کا تقاضہ ہے۔ پھر چونکہ فطرت بجائے خود بڑی حسین چیز ہے اس لئے کلام حفیظ کو حسین ہونا ہی چاہئے حفیظ کے کلام کی خصوصیت محض جذبات نگاری نہیں بلکہ اس کا وہ اندازِ ابلاغ ہے جو براہِ راست دل و دماغ سے زیادہ ہمارے ذوق و وجدان کو متاثر کرتا ہے اور یہی حفیظ کی خصوصیت و شہرت کا راز ہے۔ حفیظ نظم نگار بھی ہے اور غزل گو شاعر بھی، لیکن کسی شاعر میں ان دونوں خصوصیتوں کا ایسا امتزاج کہ ہم ایک کو دوسرے سے جدا نہ کر سکیں بہت کم کسی میں پایا جاتا ہے۔ تاہم اگر غایر نظر سے دیکھا جائے تو حفیظ سب سے پہلے نظم گو شاعر ہے اور اس کے بعد غزل گو، گو اس کی نظموں کی جان بھی ان کا تغزل ہی ہے۔

یہ مجموعہ مجلس اُردو کتاب خانہ حفیظ اُردو بازار (لاہور) نے شایع کیا ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا حفیظ کا کلام۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔

جگناتھ آزاد

انتخاب کلام ہے جگناتھ آزاد کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا جسے انجمن ترقی اُردو علیگڈھ نے شایع کیا ہے اس سے اس سے قبل انجمن اسی قسم کا مختصر سا انتخاب بارہ دیگر مشہور شعراء کا شایع کر چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نوع کے انتخابات گو مختصر ہوتے ہیں لیکن وہ شاعر کا تعارف ضرور ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو شعراء کے پورے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا انتظار نہیں کر سکتے یا ان کے مطالعہ کے لئے کافی وقت نہیں دے سکتے۔ یہ سلسلہ بہت مفید ہے۔

جگناتھ آزاد اس وقت کے اُن پختہ کار، پختہ فہم اور ذی شعور شاعروں میں سے ہیں، جن کا کلام بڑی معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ جگناتھ آزاد، نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں بہت سنبھل کر اور بڑے "کار آگہانہ" طریقہ سے کہتے ہیں

ن کے جذبات کی صداقت لب ولہجہ کی شگفتگی، انداز بیان کی دلکشی اور خیال کی بلندی بڑا رچاؤ اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کا راز صرف یہ ہے کہ ان کا تعلیمی پس منظر کلاسکی پختگی اپنے اندر رکھتا ہے اور فارسی زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے اس کی حلاوت وشیرینی بھی ان کے کلام میں منتقل ہوگئی، اس انتخاب کی قیمت ۱۲ر ہے۔

سکندر علی وجد

سکندر علی وجد کے منتخب کلام کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے انجمن ترقی اُردو علیگڈھ نے شایع کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۵۲ء میں شایع ہوا تھا اور اب اسی کا یہ دوسرا اڈیشن ترمیم واضافہ کے بعد شایع کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں وجد کی صرف ۲۴ نظمیں اور ۲۸ غزلیں درج ہیں جو ۳۵ء سے لیکر ۵۵ء کے تمام کلام سے انتخاب کی گئی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انتخاب کرنے والے نے صرف اپنے ذوق پر اعتماد کیا ہے یا کسی خاص اصول پر، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اچھا ہے اور اس میں وجد کے آرٹ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ وجد ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اس قدر معروف ومقبول ہیں کہ ان کی شاعری پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ وجد کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنی نظموں میں بھی غزل کی لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، مجاز کے علاوہ کسی اور شاعر میں ہم کو بہت کم ملتی ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ان کی لطیف وشیریں ترکیبیں، سہل وسبک انداز بیان، اور جذبات کا معتدل بہاؤ، سب یہ باتیں مل کر ان کی شاعری میں خاص ترنم پیدا کر دیتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ترنم میں کھو دینے پر مجبور پاتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو نے اسے نہایت اچھے کاغذ پر شایع کیا ہے اور قیمت بھی صرف ۷۵ پیسے رکھی ہے تاکہ ہر شخص اس کو بہ آسانی حاصل کر سکے۔

مجذوب اور ان کا کلام

خواجہ عزیز الحسن غوری، مولانا تھانوی کے خصوصی مریدوں میں سے تھے اور بڑے خوشگو شاعر، اس کا علم خاص خاص لوگوں کو تو ہے، لیکن عام لوگ اس سے واقف نہیں۔ حالانکہ ان دونوں حیثیتوں سے ان کو مشہور ہونا چاہئے تھا۔ وہ بڑے زاہد ومرتاض انسان تھے اور مولانا تھانوی کے اکثر مریدوں کو میں نے ایسا ہی پایا ہے لیکن صاحبدل ہونے کی حیثیت سے غوری صاحب کو خانوادۂ تھانہ بھون میں خصوصیت خاصہ حاصل تھی، جس کا علم زیادہ تر انھیں لوگوں کو ہے جن کو مجذوب صاحب کی معیت حاصل تھی یا جنھیں ان کی زبان سے ان سے اشعار سننے کا موقع زیادہ ملا تھا۔ چنانچہ مولانا رضا انصاری بھی انھیں میں سے ایک تھے، جنھوں نے خواجہ صاحب کو ان کی معیت وشاعری دونوں سے پہچانا اور اس قدر والہانہ تاثر کے ساتھ پہچانا کہ وہ اس کتاب کے لکھنے پر مجبور ہوگئے۔

مجذوب صاحب نے بہت کچھ کہا گو مولانا تھانوی ان کی شاعری کے موافق نہ تھے، اس لئے انھوں نے جو کچھ کہا اس کو محفوظ نہ رکھا اور ان کا صرف اتنا ہی کلام محفوظ رہ سکا جو صرف چند حضرات اور خصوصیت کے ساتھ مولانا رضا کو یاد رہ گیا تھا۔

مجذوب صاحب یقیناً درجہ اول کے غزل گو شاعر نہ تھے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے بعض اشعار میں بعض باتیں ماورائے غزل بھی کچھ ایسی پائی جاتی تھیں جن کا سننے والے پر خاص اثر ہوتا تھا اور جو لوگ ان کے کلام کو خود انکے مترنم لب ولہجہ میں سنتے تھے ان پر مجذوب کے کلام کا بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔

ابتدا میں فاضل مرتب کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں کلام مجذوب پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی روشنی میں کلام مجذوب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

۲۴۰ صفحات کا انتخاب سیکڑوں اشعار پر مشتمل ہے اور یہ سب وہ ہیں جو رضا صاحب کے حافظہ میں محفوظ رہ گئے تھے۔

فرنگی محل کی عبدالباری اکاڈیمی کی یہ پہلی کتاب ہے اور خوشی کی بات ہے (گو تعجب کی بھی) کہ اس اکاڈیمی کا افتتاح کسی مذہبی کتاب سے نہیں کیا گیا)

کتابت وطباعت بھی اس کی بہت صاف ستھری ہے اور کاغذ بھی نفیس۔ قیمت عہ/ ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ:۔ فرنگی محل کتاب گھر لکھنؤ

حیاتِ آشوب تصنیف ہے جناب امداد صابری کی جس میں انھوں نے ماسٹر پیارے لال آشوب کی زندگی اور ان کے ادبی وصحافتی کارناموں کو پیش کیا ہے۔ ماسٹر آشوب دہلی کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد تھے۔ انھوں نے مولانا ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ دہلی کالج میں تعلیم پائی اور اس کے بعد محکمۂ تعلیم سے متعلق ہوگئے، غالب سے بھی ان کے کافی مراسم تھے اور قاطع برہان کے سلسلہ میں غالب نے جو مقدمہ دائر کیا تھا اس میں انھوں نے غالب کی طرف سے گواہی بھی دی تھی۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سوسائٹی قایم ہوئی تو یہ اس کے سکریٹری بنائے گئے اور انھیں کی سرگرمی کی وجہ سے یہ سوسائٹی عرصہ تک زندہ رہی۔ ماسٹر آشوب بڑے اچھے صحافی بھی تھے اور اس عہد کے ان علم دوست افراد میں سے تھے جنھوں نے غدر کے بعد دہلی میں ایک خاص علمی وادبی فضا پیدا کردی تھی، لیکن ان کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے۔

صابری صاحب نے اچھا کیا کہ ماسٹر آشوب کے حالات فراہم کرکے انھیں ایک کتاب کی صورت میں شایع کردیا۔

یہ کتاب دو روپیہ میں جناب امداد صابری سے چوڑی والان دہلی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

ادبی تجزیے پروفیسر مبشر علی صدیقی کے نو تبصروں اور انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں شرر کو چھوڑ کر باقی جن ادیبوں یا شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مبشر صاحب بالکل "تازہ واردانِ بساط" میں سے نہیں ہیں۔ ان کے ادبی وتنقیدی مقالات کے دو تین مجموعے اس سے پہلے بھی شایع ہوچکے ہیں وہ یقیناً صف اول کے ادیب ونقاد نہیں ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں خود ان کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اپنی رائے قایم کرنے میں دوسروں کا سہارا کم لیتے ہیں۔ انداز بیان خاصا شگفتہ ہوتا ہے۔

قیمت عہ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم دریا گنج دہلی۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔

رضوان شاہ وروح افزا مثنوی ہے ایک قدیم دکنی شاعر فایز کی جسے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ فایز، قطب شاہی خاندان کے آخری فرمانروا ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ کا شاعر تھا۔ یہ مثنوی جو قطب شاہی عہد کی آخری مثنویوں میں ہے، ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۲ء) میں لکھی گئی تھی۔ اس کا ہیرو رضوان شاہ (چین کا شاہزادہ) ہے جو روح افزا (پری) پر عاشق ہوجاتا ہے اور بڑی دشواریوں کے بعد اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

مثنوی قصہ کے لحاظ سے معمولی لیکن اس لحاظ سے کہ اب سے تقریباً چار سو سال قبل کی اردو زبان کا نمونہ ہے، خاص اہمیت رکھتی ہے یہ قصہ فارسی نثر میں پہلے سے موجود تھا۔ لیکن فایز سے پہلے اسے کسی نے منظوم نہ کیا تھا۔ اس مثنوی کا مخطوطہ نواب سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا تھا اور اسی کو دوسرے قلمی نسخوں کے مطابق کرنے کے بعد، شایع کیا گیا ہے۔

ضخامت ۱۶۶ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ کاغذ وطباعت پسندیدہ۔

تصویر جاناں مثنوی ہے لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کی جو دکن کی ادبیات میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ شفیق کے والد لالہ نمسارام، آصف جاہ اول کے پیشکار تھے اور آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں یہ خود بھی نظارت کے عہدہ پر ممتاز تھے آصف جاہ ثانی کے فرزند نواب میر احمد علی خاں جاہ، شفیق کے بڑے قدر دان تھے۔ شفیق آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے اور اپنے عہد کے بڑے ممتاز ادیب و شاعر، یہ بڑے اچھے مورخ وتذکرہ نگار بھی تھے اور ایک اردو مجموعہ نظم کے علاوہ آٹھ تصانیف اور اپنے بعد چھوڑ گئے، ان میں ایک چمنستان شعرا (اردو شاعروں کا تذکرہ) دوسرا گلِ رعنا (ہندو مسلمان فارسی گو شعراء کا تذکرہ) اور شام غریباں (شعراء ایران مقیم ہندوستان کا تذکرہ) بھی ہے۔

شفیق بڑے پرگو شاعر تھے۔ غزلوں قصیدوں کے علاوہ انھوں نے کئی مثنویاں بھی لکھیں جن میں سب سے زیادہ اہم "تصویر جاناں" ہے۔ یہ دراصل صرف سراپا ہے جس نے پوری مثنوی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ اب سے ۲۰۰ سال قبل ہی اُردو زبان کتنی نکھر چکی تھی۔

اس مثنوی کا مخطوطہ بھی سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا، جسے دوسرے نسخوں سے مطابق کرکے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدر آباد نے شایع کیا ہے۔ شروع میں خواجہ حمید الدین شاہد نے اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے، شفیق کے حالات اور اس مثنوی کی خصوصیات کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ ضخامت ۷۰ صفحات، قیمت درج نہیں ہے۔

چندر بدن و مہیار

مثنوی ہے مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری کی۔ یہ ایرانی نژاد تو غالباً نہ تھا لیکن نسباً ضرور ایرانی تھا اور فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ یہ بیجاپور کے فرمانروا عادل شاہ کے زمانہ میں پایا جاتا تھا اور شعراء دربار میں اسے خاص امتیاز حاصل تھا۔ اس نے ایک فارسی دیوان بھی اپنے بعد چھوڑا اور چند مثنویاں بھی دکھنی اُردو میں۔ انھیں میں سے ایک "چندر بدن و مہیار" ہے اس میں ایک مقامی قصہ ان دونوں کی محبت کا نظم کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی اب سے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اُردو زبان کس منزل سے گزر رہی تھی۔

یہ مثنوی بھی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات نے شایع کی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات، طباعت و کتابت وغیرہ دیدہ زیب۔

سحر حلال

انتخاب کلام ہے جناب سحر بھوپالی کا جو انھوں نے خود شایع کیا ہے اس میں غزلوں کے علاوہ چند تظمیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ سحر صحیح معنی میں جذبات کے شاعر ہیں اور اپنے تاثرات کو نہایت سادگی سے بیان کردینا انکی خصوصیت تغزل ہے۔ آورد و تکلف جو غزل کے قطعاً منافی ہے ان کے یہاں نہیں پایا جاتا اور اسی لئے ان کی غزل گویا ئی یکسر واردات اور ایک دُکھے ہوئے دل کی داستان ہے جس کا اثر ہر شخص پر ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کے رنگ تغزل کی خصوصیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

وہ کچھ کہتے تھے مرا بھول جانا — انھیں مل گیا چھیڑنے کو بہانہ
یہ دردِ محبت بھی عجب چیز ہے جس کا — آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے
رموز مقصد ہستی سمجھ گیا ہوں میں — کہ موت و زیست میں نازک سا واسطہ ہوں میں
نگاہِ شوق پہ لے، دوست تیری دید حرام — جو تجھ سے چھوٹ کے اکبار بھی نہ سا ہوں میں
وفورِ درد میں بھی مسکرا دیتا ہوں پرسش پر — کیا ہے قصۂ غم کو اب اتنا مختصر میں نے
عقل کہتی ہے نہ جا اس بزم میں — شوق کہتا ہے کہ دیکھی جائے گی
آہ سا حر مل کے وہ چھٹ بھی گئے — اب نہ جانے کب قیامت آئے گی

اس قسم کے دلدوز اشعار ان کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۸۸ صفحات کا خود سحر صاحب سے اس پتہ پر مل سکتا ہے:-
۵۵۶ - ڈلائل روڈ بائکلا - بمبئی (۱۱)

اُردو رسم خط اور طباعت

مجموعہ ہے پروفیسر ہارون خاں شروانی کے دو مضمونوں کا جو ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۶ء میں "اُردو ادب، رومن رسم خط" رسالۂ اُردو ادب میں شایع ہوئے تھے۔

اُردو رسم خط کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے عرصہ سے اس پر غور کیا جارہا ہے اور اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا کہ "اُردو کے موجودہ رسم خط" کو قایم رہنا چاہئے یا نہیں اور بہ صورت تبدیلی اس کو رومن رسم خط اختیار کرنا چاہئے یا کوئی اور۔

فاضل مقالہ نگار نے ان مضمونوں میں اسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بڑا ماہرانہ تبصرہ کیا ہے اور اس کے ہر عملی پہلو کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ لیتھو کے چھاپہ کو فی الفور ختم کردینا چاہئے۔

اس سلسلہ میں انھوں نے نستعلیق، نسخ اور رومن رسم خط پر بھی گفتگو کی ہے اور ان فواید کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو ٹائپ کے رواج سے ہمیں حاصل ہوسکتے ہیں، لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ موجودہ نستعلیق خط کی لیتھو طباعت میں، کوئی

آسانی پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں اور اگر اس کا امکان ہے تو کیوں نہ اس کی کوشش کی جائے۔

بہرحال فاضل مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے نہایت خلوص و ہمدردی کے ساتھ لکھا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ رسالہ مہتمم مطبوعات مسعود منزل، حمایت نگر حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام

میاں داد خاں سیاح، گجرات کے رہنے والے تھے اور اس لحاظ سے کہ وہ اپنا کلام کبھی کبھی غالب کو بھی دکھایا کرتے تھے۔ تلامذۂ غالب میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

ان کے کلام کا مجموعہ ایک بار ضایع ہو چکا تھا اور کوئی امید نہ تھی کہ اس کا کوئی حصہ پھر مل سکے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (پروفیسر اردو اسماعیل جوگیشوری کالج بمبئی) کو اس کے بعض اجزاء پھر ہاتھ آگئے اور انھوں نے اسے شایع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیوان سیاح سے زیادہ اہم وہ مقدمہ ہے جو فاضل مرتب نے تحریر کیا ہے اور جس سے "غالب و غالبیات" کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ قاضی عبدالودود صاحب کا بھی ایک مختصر سا مضمون جو تکملہ کے عنوان سے شایع کیا گیا ہے خاص اہمیت رکھتا ہے جنھوں نے سیاح کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی نوعیت پر بھی اچھا تبصرہ کیا ہے، سیاح غزلیں بہت معمولی کہتے تھے لیکن چونکہ وہ غالب کے ایک شاگرد تھے، اس لئے اچھا ہوا کہ پروفیسر مدنی صاحب نے ان کا کلام پیش کرتے ہوئے خود ان کے حالات بھی فراہم کر دئے جو بجائے خود کافی دلچسپ ہیں۔ یہ کتاب پروفیسر موصوف سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

خوشحالی کے لئے منصوبہ بندی

حکومت ہند نے یہ کتاب اس لئے شایع کی ہے کہ عوام کو اس بات سے آگاہی ہو سکے کہ حکومت کی منصوبہ بندیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور ان کی تکمیل سے ملک کو کتنا فایدہ پہونچے گا، چونکہ ہندوستان میں معیشت و معاشرت کا مسئلہ اب عملی حدود کے اندر آگیا ہے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے ملک کا عام تعاون ضروری ہے، اس لئے اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم حکومت کو یہی اٹھانا چاہئے تھا کہ وہ منصوبہ بندیوں کے فواید و نتائج عوام پر ظاہر کر دے اور اس کتاب کی اشاعت کا مقصود یہی ہے۔

یہ کتاب نہایت سادہ و سلیس زبان میں داستان کے انداز سے لکھی گئی ہے تاکہ ہر شخص اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور اس کی قیمت بھی صرف بارہ آنے اسی لئے رکھی گئی ہے کہ عوام اسے آسانی سے حاصل کر سکیں۔

تقویم فتحمندی

یہ ایک بڑے سائز کی کتاب ہے ۵۰۰ صفحات کی جس میں علی بخش صابری مدعی مہدویت نے اپنے رویائے صالحہ کو یکجا کر دیا ہے۔

اس کتاب میں ان کے سیکڑوں خواب درج ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ایسے عجیب و غریب روحانی خواب دیکھنے کے بعد کسی کے اندر یہ رجحان پیدا ہو جانا کہ وہ "مہدی موعود" ہے تعجب کی بات نہیں۔

جناب صابری کو عالم غیب بعض امراض کے "تیر بہدف" نسخے بھی عطا ہوئے ہیں اور وہ ان نسخوں کے مطابق دوائیں طیار کر کے انھیں فروخت بھی کرتے ہیں۔ جن کو ضرورت ہو وہ

اقبال بنگلہ نمبر ۵ سنٹ سیبسٹین کالونی باندرہ بمبئی کے پتہ پر صابری صاحب سے خط و کتابت کریں۔

کتاب کی قیمت انھوں نے چودہ روپئے مقرر کی ہے۔

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے توقیت مرتب کی تھی جس میں ۵۱ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بقید سنہ ہجری یکجا کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ